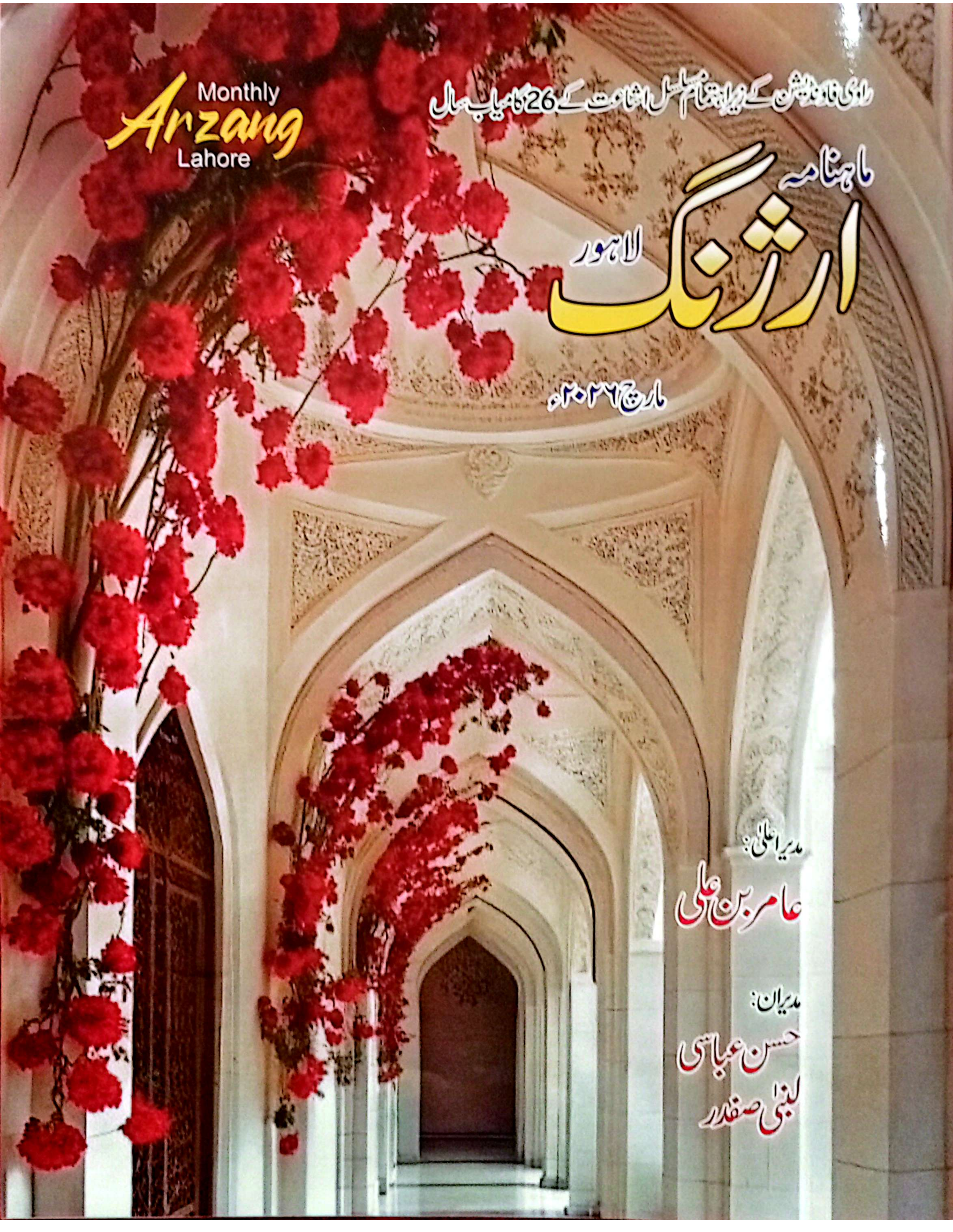

راوی فاؤنڈیشن کے زیر اہتمام مسلسل اشاعت کے 26 کامیاب سال

Monthly
Arzang
Lahore

ماہنامہ ارژنگ لاہور

مارچ ۲۰۲۶ء

مدیر اعلیٰ:
عامر بن علی

مدیران:
حسن عباسی
لبنیٰ صفدر

ادب میں خواتین کا علیحدہ ڈبہ نہیں ہے، ان کو تعصب کی نگاہ سے نہ دیکھا جائے

تخلیق محض لفظی ترتیب نہیں بلکہ باطن کی آواز ہے

معروف شاعرہ ومقبول ادیبہ، معتبر ماہر تعلیم

ڈاکٹر رابعہ سرفراز

سے مدیرِ اعلیٰ ارژنگ، معروف شاعر، کالم نگار اور سفرنامہ نگار عامر بن علی کی خصوصی گفتگو

شاعری اپنی ذات کا توسیعی اور بامعنی اظہار محسوس ہوتی ہے۔ ڈاکٹر رابعہ سرفراز

یوں تو پاکستان کا کونہ کونہ تخلیقی صلاحیتوں سے مالا مال ہے مگر خصوصاً فیصل آباد ادبی وفکری حوالے سے ایک زرخیز شہر ہے۔ یہ قدیم شہر ہونے کے ساتھ ساتھ علم وادب کے حوالے سے بڑا گنجان آباد ہے۔ اس شہر نے غزل گوئی، نظم گوئی، نعت گوئی، افسانہ نگاری، کالم نگاری اور تنقید نگاری میں علم وادب کو وہ سرمایہ مہیا کیا جو کہ شائد کسی اور شہر کے حصے میں نہ آیا ہو۔ ناز خیالوی، نصیر بلوچ، محمد اعظم چشتی، ڈاکٹر ریاض مجید، حسن نثار اور صائم چشتی وغیرہ جیسے عظیم لوگ اسی شہر کا سرمایہ تھے۔ انہی عظیم شعراء اور ادیبوں کے درمیان اردو ادب کا ایک اور نام ڈاکٹر رابعہ سرفراز کا ہے جو کہ نہ صرف کئی کتب کی مصنفہ ہیں بلکہ ایک نہایت شفیق اور محنتی استاد بھی ہیں۔ وہ غزل گوئی بھی کرتی ہیں۔ نظم کہنے میں ماہر ہیں۔ انہوں نے قدیم شعراء کی روایت کو قائم رکھتے ہوئے نثری نظم نئے مضامین کے ساتھ بھی کہی ہے۔ وہ آزاد نظم بھی کہتی ہیں۔ سیرت النبی ﷺ پر وہ ایک کتاب بعنوان ''سیدنا احید'' لکھ چکی ہیں۔ وہ مترجم بھی ہیں، کئی انگریزی کتابوں کے اردو تراجم بھی کر چکی ہیں۔ اکیس کتابوں کی مصنفہ ڈاکٹر رابعہ سرفراز ان دنوں گورنمنٹ کالج یونیورسٹی فیصل آباد میں شعبہ اردو کی چیئر پرسن ہیں۔

ارژنگ:۔ کس ماحول میں آنکھ کھلی؟ گھر اور اہل خانہ کے بارے میں بتائیے گا؟

رابعہ سرفراز:۔ ہم ایک بہن اور تین بھائی ہیں۔ ہمارے گھر کا ماحول ایسا تھا کہ ابتدا سے شعروادب کو بچوں کی تربیت کا لازمی حصہ بنایا گیا۔ میرے والد صاحب وکیل تھے۔ نومبر 2018 میں وہ اپنے خالق حقیقی سے جا ملے (اعلیٰ شعری وادبی ذوق کے مالک تھے انہوں نے ہمارے گھر میں ایک لائبریری بنا رکھی تھی۔ جس میں ان کی پسندیدہ شعری کتب کلیات اور اردو نثر کی دیگر کتب بکثرت تھی''۔

ارژنگ:۔ ابتدائی تعلیم اور اعلیٰ تعلیم کیسی رہی؟

رابعہ سرفراز:۔ میں نرسری جماعت سے ہی بہت ذہین اور قابل طالبہ تھی۔ میں نے اپنے پورے تعلیمی کیریئر میں کبھی دوسری پوزیشن حاصل نہیں کی۔ ہمیشہ ہر جماعت میں اول آئی۔ میرے والدین نے میری تعلیم وتربیت بہت توجہ، انہماک اور محبت سے کام لیا۔ انہیں میری ذہانت اور قابلیت کے نتائج سے بے حد طمانیت اور سرشاری ہوتی۔ میں نے میٹرک سائنس کے ساتھ کیا۔

ارژنگ:۔ اپنے پرائمری، مڈل اور ہائی سکول کے بارے میں بتائیے؟

رابعہ سرفراز:۔ میں نے سینٹ میری سکول سے پرائمری تک تعلیم حاصل کی۔ ہر کلاس میں اول پوزیشن حاصل کرتی رہی ہوں۔ چھٹی سے دسویں تک گورنمنٹ پبلک گرلز ہائی سکول سے تعلیم حاصل کی۔

ارژنگ:۔ کالج اور یونیورسٹی کے بارے میں بتائیں؟

رابعہ سرفراز:۔ کالج میں نفسیات اور اردو ادب کے مضامین پڑھے۔ ایف اے سے ایم اے تک گورنمنٹ کالج برائے خواتین مدینہ ٹاؤن فیصل آباد سے تعلیم حاصل کی۔ ایم اے اردو کیا۔ ایم اے کے لئے اس کالج کا الحاق پنجاب یونیورسٹی لاہور سے تھا۔ پھر ایم فل اور بعد ازاں پی ایچ ڈی سندھ سے حاصل کی تھی۔

بقیہ اندرونی صفحات پر

راوی فاؤنڈیشن کے زیر اہتمام مسلسل اشاعت کے 26 کامیاب سال

ماہنامہ ارژنگ لاہور

عالمی سطح پر اردو ادب کا ترجمان

MONTHLY Arzang LAHORE

مارچ 2026ء جلد 27 شمارہ 3

مدیر اعلیٰ

▪ عامر بن علی

مدیران

▪ حسن عباسی
▪ لبنیٰ صفدر

مجلس ادارت

▪ ڈاکٹر جعفر حسن مبارک

مجلس مشاورت

▪ ارشد نذیر ساحل (سپین)

کمپوزنگ: زرناب کمپوزنگ 0321-4730769

فوٹوگرافر: نعمان حسن 0333-4918383

پتہ برائے خط و کتابت

ماہنامہ ارژنگ F-3 الفیروز سنٹر غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور
0300-4489310

سالانہ ممبرشپ

ماہنامہ "ارژنگ" کے سالانہ خریدار بننے کے لیے نام اور شناختی کارڈ نمبر پر مبلغ -/1500 روپے بذریعہ موبی کیش رقم بھیجیں اور سالانہ خریدار بن جائیں۔

حسن محمود: 0300-4489310 شناختی کارڈ نمبر: 31204-7298386-9

فہرست

حمد، نعت ، 2 تا 3

مضامین:
○ اسباب زوالِ اُمت اور فکرِ اقبال / ڈاکٹر تحسین فراقی ، 4
○ صنفِ غزل کے بارے میں / ڈاکٹر ستیہ پال آنند ، 7
○ ہزارہ میں آپ بیتی کی روایت / قمر زمان ، 11
○ عود نگری کی خوشبو / سرور حسین نقشبندی ، 13

گوشۂ ڈاکٹر علی محمد خاں:
○ خاکہ: علی محبت خاں / ڈاکٹر اشفاق احمد ورک ، 15
○ ملنے کے نہیں نایاب ہیں ہم / ڈاکٹر سعدیہ حسن بلوچ ، 18
○ ادب برائے فروخت / لبنیٰ صفدر ، 21

شعری گوشے: جبار واصف ، طیبہ مرزا 23 تا 24

انٹرویو:
○ بقیہ انٹرویو: ڈاکٹر رابعہ سرفراز ، 25
○ بقیہ انٹرویو: مظہر سلیم مجوکہ ، 27
○ اکبر معصوم کی کلیات - گلِ معانی / بلقیس ریاض ، 32

افسانے:
○ پانچ سو کا نوٹ / روبنسن سیموئیل گل ، 34
○ خواب نگری کی گڑیا / بابرہ امین ، 36

کالم:
○ کیا ہوئے وہ سوداگر جو رونق بازار تھے / عامر بن علی ، 38

گوشۂ ذوالفقار چیمہ: ○ پس پردہ / محمد بوٹا انجم ، 38
○ جہد مسلسل / علامہ عبدالستار عاصم ، 42

سفرنامہ:
○ مسجد نبوی کے روح پرور نظارے / فقیر اللہ خاں ، 44
○ یورپ کے آئینے میں خودکلامی / حسن عباسی ، 46
○ ادبی تقریبات ، 46

Far East Marketing Co.

Samana Mansion 6.5 Koanp-Minami 1-6-5
Suginami-Ku, Tokyo, 108-0003 Japan
Email: femc1@hotmail.com

حمد باری تعالیٰ

اللہ نور خود ہے خالق بھی نور کا ہے
لاریب وہ ہی مالک یومِ نشور کا ہے
شمس و قمر ستارے امرِ خدا کے مظہر
ہر ایک شے میں جلوہ خالق کے نور کا ہے
حاضر وہی ہے ہر جا لیکن نظر سے پنہاں
انداز کیا نرالا اس کے ظہور کا ہے
ارض و سما میں ہر سو حسن و بہا اسی سے
ہر اِک جہان مظہر اس کے ہی نور کا ہے
مسجود وہ حقیقی ، معبود وہ ہی تنہا
حاکم وہی حقیقی سارے اُمور کا ہے
سنتا ہے وہ ہی اختر مخلوق کی دُعائیں
سب پہ کرم جہاں میں ربِّ غفور کا ہے

جسٹس (ر) میاں نذیر اختر/لاہور

نعت

حریمِ دل میں اب اسمِ محمدؐ کی ہیں تنویریں
چمکتی ہیں نگاہوں میں حسیں طیبہ کی تصویریں
بیاں جن میں ملے سرکارؐ کی توصیف و مدحت کا
نہایت خوشنما لگتی ہیں وہ اُجلی سی تحریریں
حریمِ روضۂ اقدس میں حاضر ہو کے جب میں نے
طلب کی مغفرت، بخشی گئیں سب میری تقصیریں
محبت اور ادب سے جو درِ اقدس پہ آ جائیں
سنور جاتی ہیں پھر لاریب بگڑی اُن کی تقدیریں
جو رکھیں اپنی آوازوں کو اُونچا صوتِ نبویؐ سے
بایں صورت خدا سے پائیں گے وہ سخت تعزیریں
ہر اک ذرہ ہے طیبہ کا مقدس نور کا پیکر
عیاں ہوں نور کے عالم اگر ذرّوں کے دل چیریں
نگاہِ عشق میں طیبہ ہے سب فردوس کی صورت
مناظر چار سو آئیں نظر جنت کی تصویریں
رہے ہر سمت طیبہ میں کبھی محوِ خرام آقاؐ
وہاں موجود ہیں اُنؐ کے نقوشِ پا کی تنویریں
احد ہو یا بقیع ہو یا قبا و مسجدِ نبویؐ
وہاں شمس الضحیٰ کی چار سو پھیلی ہیں تنویریں

جسٹس (ر) میاں نذیر اختر/لاہور

سخن کا سبز حدیقہ عطا کیا جائے
کہوں میں نعت ، سلیقہ عطا کیا جائے
تڑپ رہا ہوں مدینے میں حاضری کے لیے
حضورؐ، کوئی طریقہ عطا کیا جائے
نہ روک پائے مجھے راستے میں کوئی کہیں
سفر کا ایسا نمیقہ عطا کیا جائے
میں اپنی عمر کو اُس میں سمیٹ لوں گا حضورؐ
مجھے بس ایک دقیقہ عطا کیا جائے
یہ میری آنکھ کے رستے سے اپنا حال کہے
مجھے وہ قلب رقیقہ عطا کیا جائے
ارادہ کرتے ہی میں اُس نگر پہنچ جاؤں
قرینہ اور طریقہ عطا کیا جائے
جو نعت کہتا ہوں ابلاغ اُس کا ہو سب پر
مجھے وہ حُسنِ بوطیقا عطا کیا جائے
لکھی ہے نعت جو با چشمِ نم نسیم، اُسے
قبولیت کا وثیقہ عطا کیا جائے

نسیم سحر/راولپنڈی

میں نے دل کو ادب آداب میں رکھا ہوا ہے
نعت کے قریۂ شاداب میں رکھا ہوا ہے
کچھ اگر ہے تو فقط گنبد خضرا کا جمال
ورنہ کیا عالمِ اسباب میں رکھا ہوا ہے
وہ اثر دل میں لیے پھرتا ہوں خوشبو کی طرح
ان کی چاہت کے جو ہر باب میں رکھا ہوا ہے
یا نبیؐ اذنِ حضوری کی تمنا کے سوا
کیا بھلا اس دل بے تاب میں رکھا ہوا ہے
عکس لگتا ہے رضا حُسنِ شہِ بطحاؐ کا
جو اُجالا رُخِ مہتاب میں رکھا ہوا ہے

علی رضا/ساہیوال

کھڑا تھا جالیوں کے اک طرف میں دست بستہ سا
بنائے پھر رہے تھے اشک رُخساروں پہ رستہ سا
تمنا بے تحاشہ ہے مگر ہمت نہیں پڑتی
ارادہ عشق والوں سا بدن دیوارِ خستہ سا
اچانک کھل گئے آنکھوں پہ دروازے مدینے میں
زمیں نے آسماں دیکھا ہوا تھا جستہ، جستہ سا
درِ اقدس کی نسبت کا ہوا مجھ پر اثر ایسا
نصیبا، اُوج پر دیکھا، مقدر پا خجستہ سا
سخی کا فیض ہے ورنہ یہاں آیا تھا میں آکاشؔ
نظر محدود سی لے کر تخیل پر شکستہ سا

احمد سبحانی آکاش/لاہور

مدینے کی جانب قدم جب اُٹھے گا
یقیناً یہ دل مجھ سے آگے چلے گا
مری نعت مہکے گی محفل میں جب بھی
مرا دل بھی محفل میں دُولہا بنے گا
مرا دل ہے کہتا، کبھی نہ کبھی تو
زمانہ مجھے اُنؐ کا شیدا کہے گا
میں مرنے کی دُھن میں مرا جا رہا ہوں
مجھے قبر میں عشق میرا ملے گا

CamScanner

سنبھالیں گے آخر مجھے میرے آقاؐ
زمانہ مجھے تنگ کتنا کرے گا
یہ نعتیں ہیں، جس کی وہ سنتا بھی ہے شخص
سناتے رہیں ہم وہ سنتا رہے گا

زاہد محمود زاہد/ ملتان

جئیں جو ان کے لیے تو حلال ہے جینا
نبیؐ کے شہر میں جینا، کمال ہے جینا
جو لوٹ آئے ہیں اُن کا مُحال ہے جینا
جنھیں ملا ہے ٹھکانہ نبیؐ کی جنت میں
وہ خوش نصیب ہیں اُن کا مثال ہے جینا
قرار دل کو میسّر نہیں خدا کی قسم
گناہ گار ہوں آقا! ملال ہے جینا
نصیب جن کو ہو سرکارؐ کی نگاہِ کرم
حیات، حُسن ہے اُن کی، جمال ہے جینا
حضورؐ! آپؐ سے یہ بزم کائنات بجی
سوائے آپؐ کے خواب و خیال ہے جینا
اگر جو دل میں نہیں یادِ احمدِ مُرسَلؐ
تو جان لیجے فقط اِک وَبال ہے جینا
حرام ہے کہ جئیں اپنے واسطے انجم
جئیں جو ان کے لیے تو حلال ہے جینا

غزالہ انجم

معراج شریف

یہ دسواں سال تھا سرکار ﷺ کے دورِ نبوت کا
گِرا تھا ناگہاں کوہِ گراں غم کا مصیبت کا
اِسی ہی سال میں پردہ کیا حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے
ابوطالب رضی اللہ عنہ بھی رحلت کر گئے اِس سال دُنیا سے
بڑے مغموم تھے اِن ہستیوں کا ساتھ جو چھوٹا
اِسی ہی واسطے یہ سال عامُ الحزن کہلایا
اِسی ہی سال طائف میں خُدا ﷻ کے دین کی خاطر
خُدا ﷻ کے نام پر کھائے وہاں پر آپ ﷺ نے پتھر
وہاں کے کافروں نے آپ ﷺ کو بے حد ستایا تھا
وہاں تبلیغ سے اِک شخص بس ایمان لایا تھا
نبی ﷺ کو غمزدہ پا کر ہُوا اِظہار رحمت کا
تو اگلے سال ہی پھر یُوں کیا سامان راحت کا
کہا جبریل علیہ السلام سے رب ﷻ نے سُوئے محبوب جاؤ تم
مِرے محبوب ﷺ کو معراج کا مُژدہ سُناؤ تم
ملائک کے جَلو میں حضرتِ جبریل علیہ السلام پھر آئے
نبی ﷺ کی پاک خدمت میں پیامِ ایزدی لائے
حرم سے مُتّصل گھر میں جنابِ اُمِ ہانی رضی اللہ عنہا کے
وہاں آرام کرنے کو رسُولِ پاک ﷺ تھے لیٹے
کیا ہونٹوں کو مَس جبریل علیہ السلام نے پائے رسالت ﷺ سے
حبیبِ کبریا ﷺ یُوں اُٹھ گئے پھر اِستراحت سے
سلامِ کبریا پہلے نبی ﷺ کو آن پہنچایا
بتایا کہ خُدا ﷻ نے عرش پر ہے آج بُلوایا
خُدا ﷻ خُود منتظر ہے اے حبیبِ کبریا ﷺ چلیے
کہ سُوئے لامکاں اَب سیر کرنے مُصطفٰے ﷺ چلیے
مَلک پھر آپ ﷺ کو لائے حطیمِ پاک کے اندر
جہاں پر مُصطفٰے ﷺ کا شق کیا پھر سینۂ انور
سفر کا پہلا حصّہ تھا حرم سے مسجدِ اقصٰی
سواری کے لئے بُرّاق تھا اِک خُلد سے آیا
روانہ ہو گئے پھر آپ ﷺ سُوئے مسجدِ اقصٰی
سُہانی رات تھی ہر سمت ہی اِک کیف تھا چھایا
نبی علیہم السلام موجود اقصٰی میں تھے اِستقبال کرنے کو
قطاروں میں کھڑے تھے آپ ﷺ کا دیدار کرنے کو
اِمامت مسجدِ اقصٰی اِمامُ الانبیاء ﷺ نے کی
اور اُن کی اِقتدا جبریل علیہ السلام نے، سب انبیاء علیہم السلام نے کی
نبی ﷺ اگلے سفر میں اب روانہ لامکاں کو تھے
سفر میں ساتھ کو اب تک سفیرِ کبریا علیہ السلام بھی تھے
ملائک، حُور و غِلما عرش پر تھے منتظر سارے
کہ کب تشریف لائیں گے محمد مصطفٰے ﷺ پیارے
مُبارک، سیر کرنے کو خُدا ﷻ کے یار آتے ہیں
خُدا ﷻ کی سلطنت کے مالک و مختار آتے ہیں
دکھائی آپ ﷺ کو پھر سلطنت سارے جہانوں کی
سبھی مخفی خزانوں کی، زمینوں آسمانوں کی
مُلاقاتیں ہُوئیں کُچھ انبیاء علیہم السلام سے آسمانوں پر
گئے پھر آسمانوں سے پَرے سرکار ﷺ سِدرہ پر
چلے جب سِدرہ سے آگے کہا جبریل علیہ السلام نے یہ پھر
میں آگے بڑھ نہیں سکتا مِرے جل جائیں گے سب پر
سفر تھا اب یہ سِدرہ سے حریمِ قُدس کی جانب
حریمِ قُدس میں تھا خود خُدا ﷻ محبوب ﷺ کا طالب
حریمِ قُدس کو جاتے دنٰی کا جب مقام آیا
تو بڑھتے ہر قدم پر قرب کا ان ﷺ کو پیام آیا
مٹے پھر فاصلے سارے کرم سے وہ مقام آیا
خُدا ﷻ نے شان سے اپنی نبی ﷺ کو جلوہ دکھلایا
خُدا ﷻ نے مُصطفٰے ﷺ سے کیں حریمِ ناز میں باتیں
بتا دیں آپ ﷺ کو ساری خُدا ﷻ نے راز کی باتیں
مُحب ﷻ، محبوب ﷺ کی باتیں نہ کوئی دُوسرا جانے
خُدا ﷻ جانے نبی ﷺ جانے، نبی ﷺ جانے خُدا ﷻ جانے
نمازوں کا ملا تُحفہ خُدا ﷻ سے آپ ﷺ کو اِس رات
ملیں اِس رات ہی سُورہ بقر کی آخری آیات
حبیبِ کبریا ﷺ مل کر خُدا ﷻ سے، لوٹ آئے پھر
سُنایا آپ ﷺ نے کُفّار کو یہ واقعہ آ کر
کیا طے یہ سفر بس رات کے عرصے قلیل اندر
کہ کنڈی ہِل رہی تھی اور گرم تھا آپ ﷺ کا بستر
کہا کُفّار نے ممکن نہیں یہ جُھوٹ سارا ہے
بتاتے ہیں اُسے جا کر جو اِن ﷺ کا دوست پیارا ہے
سُنا تو، برملا تصدیق کی صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ نے
تو کھائی مُنہ کی ہر اِک دُشمنِ محبوبِ داوَر نے
نبی ﷺ جو بھی کہیں، سچ ہے، وہی تو حرفِ آخر ہے
جو ہو منکر نبی ﷺ کا بے شُبہ وہ فرد کافر ہے
سفر معراج کا سُلجھا گیا ہے گُتھیاں ساری
خُدا ﷻ نے بخش دیں محبوب ﷺ کو ہیں کنجیاں ساری
شرف جاوید نے پایا کہ جو یہ تذکرہ لکھا
حدیثِ پاک رکھ کے سامنے یہ واقعہ لکھا

جاوید منظور/ لاہور

اسبابِ زوالِ اُمت اور فکرِ اقبال

ڈاکٹر تحسین فراقی / لاہور

آتشِ انتقام، الزام تراشی، دشنام طرازی، گریباں گیری، ہاتھاپائی، ضابطہ پامالی، بے سمتی، بے جہتی، مافیا گردی، کشکول برداری، کفش بوسی اور اللے تللے جب کسی قوم کی فطرتِ ثانیہ کا روپ دھارنے لگیں تو گویا کسی بڑے حادثے کا عفریت ایک سانس کے فاصلے پر مُٹھیاں بھینچے اور منہ میں کف بھرے، دبوچ لینے کو تیار کھڑا ہوتا ہے۔ کیا ہم کسی ایسے ہی بڑے حادثے اور المیّے کے منتظر ہیں۔ میرے منہ میں خاک، مگر لگتا ایسے ہی ہے۔ اس وقت یہ قوم کسی سایۂ بوم پایہ کی منحوس گرفت میں ہے اور وقت ریت طرح ہمارے ہاتھوں سے تیزی سے نکلا جاتا ہے۔ کاش ہم سوچتے کہ ہم اس ملتِ اسلامیہ کا حصہ ہیں جس کے بارے میں سورۂ آلِ عمران میں کبھی ارشاد ہوا تھا کہ تم وہ بہترین امت ہو جو تمام انسانوں کی رہنمائی کے لیے وجود میں لائی گئی ہے، معروف کے حکم اور منکرات سے روکنے کے لیے۔ مجھے اپنی ایک مختصر نظم ''اُمتِ مظلمہ'' یاد آتی ہے: ہاتھوں پہ چٹیں لگی ہوئی ہیں/ ہاتھوں میں کاسۂ گدا ہے/ خلقوم برادراں پہ خنجر/ اور لشکرِ دشمناں میں جا ہے/ عبرت کیشو! نگاہ کرنا/ یہ اُمتِ شاہِ دوسرا ہے۔

آپ کسی بڑے شہر کے کسی چوک پر نگاہ ڈالیے، ایک قیامت کا سا منظر آپ کا منتظر ہوگا۔ افراتفری، بے ہنگم پن، ہاہاکار، تالیاں پیٹتے بھیک مانگتے خواجہ سرا، بہروپ بھرے گدا، پگڑی پوش صدقہ بٹور، گاڑیوں کے ہارنوں کا ساعت سوز شور، ایک دوسرے سے آگے نکل جانے کا جنون، ٹریفک قوانین کی شرمناک خلاف ورزی، چنگ چی کے اعصاب شکن بگٹٹ جتھوں کی حشر سامانی، پیدل چلنے والوں کے حقوق کی پامالی، یہ سب کچھ روزانہ کی روداد ہے جو روز افزوں ہے۔ یہی قیامت خیزی اور حشر سامانی ذرا چھوٹے پیمانے پر چھوٹے چھوٹے شہروں میں بھی نظر آئے گی۔ ستم بالائے ستم یہی صورتِ حال حاکم حلقوں میں بھی مشہود ہے۔ چوک کے گدڑی لگے گدا سے لے کر اقتدار کے ایوانوں میں گرداں خوش پوش اولی الامر تک ایک ہی کہانی ہے جو سالہا سال سے دہرائی جا رہی ہے اور جسے دیکھتے دیکھتے آنکھیں پتھرا گئی ہیں۔ قوم کو سمت دکھانے والے دانشور بکاؤ مال بن گئے ہیں۔ میرٹ میرٹ کی دہائی دینے والے بیچ چوراہے میرٹ بیچ رہے ہیں۔ انصاف کا کال، شفا دان کرنے والوں کی مال اندوزی، طلبِ علم سے بیزار، نت نئے موبائل فونوں پر فدا، آداب و اخلاق سے تہی بے مہار نژادِ نو۔ یہ ہے ہمارے مستقبل کا اثاثہ۔ ہمیں یہ احساس تک نہیں کہ صرف لمحۂ موجود میں زندہ رہنے والوں سے مستقبل ہمیشہ کے لیے روٹھ جاتا ہے، کلیۃً روگردانی اختیار کر لیتا ہے۔ من حیث القوم ہم نے ہر مثبت قدر اور شے کو منڈی کا مال بنا دیا ہے۔ فوری نفع اندوزی اور جلبِ قوت و اقتدار کی ہوس اور للک نے ہر چیز داؤ پر لگا دی ہے۔ میرے بعض دوست کہتے ہیں کہ وطنِ عزیز کو کچھ نہیں ہونے والا۔ یہ رمضان المبارک کی شبِ قدر کو وجود میں آیا، اسے ہمیشہ قائم رہنا ہے۔ یہ استدلال سر آنکھوں پر مگر قوموں کے عروج و زوال کے صدیوں پر پھیلے منظرنامے کو نگاہ میں رکھنے والے اس طرزِ فکر کو خوش فہمی اور خود فریبی قرار دینے میں حق بہ جانب ہیں۔ بلاشبہ وطنِ عزیز نے ایک مبارک رات میں ظہور کیا اور اس کی بنیاد اللہ کی توحید پر رکھی گئی لیکن سوال یہ ہے کہ کیا ہم نے تخلیقِ پاکستان کے اس مقصدِ وحید کو پیشِ نظر رکھا؟ کیا اس ملک میں اللہ کی حاکمیت کہیں نظر آتی ہے؟ سوائے زبانی جمع خرچ اور روایتی لب جا کری کے ہمارے پلّے میں کیا ہے؟ کاش ہم ہوش کے ناخن لیں۔ کیا ہم بھول گئے کہ ایک مبارک رات کو وجود میں آنے والے اس ملک کا آدھے سے زیادہ حصہ ہماری ناانصافیوں اور کھوکھلے کبر و غرور کے ہاتھوں آج سے باون برس پہلے ہم سے الگ ہو گیا تھا؟ فاعتبروا یا اولی الابصار۔ آج ہمارا حال حضرت عیسیٰؑ کی گم شدہ بھیڑوں سے کہیں زیادہ دگرگوں ہے۔ کاش ہم یہ سوچتے کہ ہمارا حال و مستقبل اور ہمارا مرنا جینا اسی وطنِ عزیز [اور ملتِ اسلامیہ] سے مشروط ہے، وہی وطن جو کلمہ لاالٰہ سے ہمارے تعہد کے نتیجے میں وجود میں آتا تھا اور جسے ہم نے تخلیقِ پاکستان کے چند ہی برسوں کے اندر اندر طاقِ نسیاں کی نذر کر دیا تھا!

فلسفۂ تاریخ سے دلچسپی رکھنے والوں اور تاریخ کے تہ در تہ اوراق کا تجزیہ کرنے والوں نے قوموں کے عروج و زوال کے چند در چند اسباب بتائے ہیں مگر میں نے ان سے قطع نظر اپنے اور خود معاصر عہد کے نامور حکیم الامت، اقبال کے افکار میں اس دردناک صورتِ حال کا کھوج لگانے کا ارادہ کیا تو بڑے بڑے نایاب موتی ہاتھ لگے اور اندازہ ہوا کہ قوموں کے اور خود ملتِ اسلامیہ کے زوال کے اسباب پر ان کی نظر کتنی عمیق اور تہ رس تھی۔ اس ضمن میں فارسی کلام تو ایک طرف ان کا اردو کلام بھی اسبابِ زوالِ اقوام اور

زوالِ امتِ مسلمہ پر بڑے گہرے بصیرت افروز نکتے مہیا کرتا ہے اور اس ضمن میں بالِ جبریل اور ضربِ کلیم کا مطالعہ خصوصاً ناگزیر ہے۔

اسبابِ زوال کے زاویۂ نگاہ سے مذکورہ کتب اور اقبال کے عمومی مطالعے سے جو چند اہم نکات سامنے آتے ہیں، انھیں کچھ اس صورت میں مرتب کیا جا سکتا ہے: (۱) ذوقِ یقین سے محرومی (۲) حق و باطل کی تمیز کا خاتمہ (۳) فکرِ غلامانہ (۴) نانِ حلال سے بے اعتنائی (۵) نشۂ قوت واقتدار (۶) مردہ دلی (۷) حقیقی مسائل و مشکلاتِ دنیا سے بے اعتنائی (۸) تقلید اور زوالِ تحقیق (۹) طاؤس و رباب اور عیش کوشی (۱۰) ملوکیت اور سلطان پرستی (۱۱) خود انحصاری کی طرف بے توجہی (۱۲) خودی سے بیگانگی (۱۳) ملائی و پیری (۱۴) مرکز سے جدائی (۱۵) تعلیم کی بے جہتی (۱۶) احتساب اور خود احتسابی کا شدید فقدان۔

اقبال کا یہ موقف کس قدر درست تھا کہ فطرت افراد سے تو اغماض کر لیتی ہے مگر ملت کے گناہوں کو معاف نہیں کرتی۔ حق یہ ہے کہ ہم اس وقت اجتماعی گناہوں کا مسلسل ارتکاب کر رہے ہیں اور نتیجۃً اللہ کی دی ہوئی بے شمار نعمتیں ہم سے یکے بعد دیگرے چھنتی جا رہی ہیں۔ بھوک، بیماری، افلاس، ذہنی ناآسودگی، ڈیپریشن، نزولِ بلاہائے آسمانی اور قومی و بین الاقوامی بے توقیری کون سی آفت اور اذیت ہے جس سے یہ اُمتِ بے جہت دوچار نہیں۔ یہ پرخلوص اجتماعی دعا اور استغفار کا وقت ہے۔

اقبال کے نزدیک یقین سے نہ صرف خود اعتمادی پیدا ہوتی ہے بلکہ یہ الوہی برکات کے لیے بھی ناگزیر ہے۔ نیچے دروں، نیچے بروں اور کن مکن کی حالت افراد اور اقوام دونو کے لیے سامانِ ہلاکت ہے۔ اقبال نے کس قدر سچ کہا تھا: غلامی میں نہ کام آتی ہیں شمشیریں نہ تدبیریں/ جو ہو ذوقِ یقیں پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں۔ یقین کی یہی طاقت ہے جو ابراہیمؑ کو نارِ نمرود سے بے خطر کر دیتی ہے اور موسیٰؑ کو دریائے بے پایاں میں بے تامل اتر جانے کا حوصلہ عطا کرتی ہے۔ اسی لیے اقبال نے یقین کو 'اللہ مستی' اور خودی و خود انتخابی سے تعبیر کیا ہے: یقیں مثلِ خلیل آتش نشینی/ یقیں اللہ مستی، خود گزینی/ سن اے تہذیبِ حاضر کے گرفتار/ غلامی سے بتر ہے بے یقینی۔

اہلِ نظر اس حقیقت سے پوری طرح آگاہ ہیں کہ قوموں کو زوال کے پاتال سے نکالنے اور تعمیر و ترقی کی شاہراہ پر ڈالنے میں تعلیم کی حیثیت نہایت بنیادی اور اساسی ہوتی ہے۔ بدقسمتی سے یہی وہ حیات خیز عنصر تھا جس سے ہم نے برسوں سے منہ موڑ رکھا ہے۔ اگر ہمارے اربابِ اختیار صرف اسی ایک عنصر کو یک درگیر و محکم درگیر کے اصول پر اپنا لیتے اور پاکستانی نسل کو ایک ہمہ گیر، خدا مرکز، حال آگاہ، مستقبل شناس، تربیت مرتکز، کردار ساز اور نصب العین آشنا نظام کی نعمت عطا کر دیتے تو آج پاکستانی قوم سرابوں کے پیچھے بھاگ دوڑ کر ہلکان نہ ہوئی ہوتی۔ اقبال سمت آشنا اور پورے انسانی وجود کو منقلب اور متحول کر دینے والی حیات آفریں تعلیم کے خدوخال سے بخوبی آگاہ تھے اور جانتے تھے کہ ایسی تعلیم ہی انسانی کردار میں خودی، خودشناسی، روشن فکری، دیانت، غیرت، ایجاد طرازی اور تسخیرِ کائنات کی آرزو پیدا کرتی ہے۔ انگریزی استعمار کی آمد سے پہلے برِعظیم کا تعلیمی نظام بڑی حد تک محکم اور جہت آشنا تھا اور ملی اقدار کی حفاظت اور ترویج کا شعور رکھتا تھا۔ فرنگی استعمار نے پہلا ہدف ہمارے تعلیمی نظام ہی کو بنایا۔ نتیجۃً ہم من حیث القوم اپنے منفرد ملی وجود کے شعور سے محروم ہو گئے۔ رفتہ رفتہ حمیت، حوصلہ مندی اور بلند نگہی ہمارے قومی کردار سے غائب ہوتی گئی اور جلد ایک مرحلہ ایسا بھی آیا جب مسلمان غلام زادوں نے "برکاتِ انگلشیہ" کے راگ الاپنے شروع کر دیے۔ اقبال کی نظم "نصیحت" (ضربِ کلیم) یاد آتی ہے جس میں ایک فرنگی لارڈ اپنے فرزند کو نصیحت کرتا ہے کہ دیکھنا بھیڑ کے بچے کو شیر کے فضائلِ شجاعت اور تیزی و حوصلہ مندی سے ہرگز آگاہ نہ کرنا اور ہاں محکوموں کو تلوار سے زیر نہیں کرتے بلکہ ایک اور نہایت تیز دھار اور قیامت کی سی کاٹ رکھنے والی شے سے تسخیر کرتے ہیں جس کا نام تعلیم ہے: تعلیم کے تیزاب میں ڈال اس کی خودی کو/ ہو جائے ملائم تو جدھر چاہے اُسے پھیر/ تاثیر میں اکسیر سے بڑھ کر ہے یہ تیزاب/ سونے کا ہمالہ ہو تو مٹی کا ہے اک ڈھیر! اور ہم سونے سے واقعی مٹی کا ایک ڈھیر بن گئے۔ بجھی عشق کی آگ اندھیر ہے/ مسلماں نہیں راکھ کا ڈھیر ہے۔ اسی گہرے باطنی اور کرداری زوال کے نتیجے میں ہمارے اندر نفی خودی، مردہ دلی، ذہنی غلامی، غیر انحصاری، احتساب و خود احتسابی سے بے توجہی، رزقِ حلال اور صدقِ مقال سے بے اعتنائی و محرومی اور حق و باطل میں عدم تمیز کے جیسے مفاسد پیدا ہو گئے اور آج ہم اس زمین کا بوجھ ہیں:

یہ آپ ہم تو بوجھ ہیں زمین کا
زمیں کا بوجھ اٹھانے والے کیا ہوئے؟

بالِ جبریل کی ایک بے مثل نظم "پیر و مرید" ہے۔ نظم کیا ہے، قوموں کی نشاۃِ ثانیہ کے لیے ایک مجرب اور تیر بہ ہدف نسخہ ہے۔ اقبال ایک عقیدت مند

مگر ذہین مرید کی طرح پیرِ رومی سے سوال کرتے ہیں اور ان سے حیات خیز اور معانی سے لبریز جواب پاتے ہیں۔ مثلاً اس سوال کے جواب میں کہ سینے کے اندر دل کی بیداری اور خارجی کائنات کی تسخیر کیسے ممکن ہے، رومی کا جواب کس قدر معنی خیز اور تحرک آفریں ہے۔ فرماتے ہیں: بندہ باش و برزمیں رَو چوں سمند/ چوں جنازہ نے کہ بر گردن بُرند (مالک کی اطاعت اختیار کر اور گھوڑے کی طرح زمین پر حرکت کر، جنازہ نہ بن جو بے بس ہوتا ہے اور جسے دوش و گردن پر اٹھا کر سپردِ خاک کر دیا جاتا ہے)۔ گویا دل کی بیداری اطاعتِ حق سے مشروط ہے اور تسخیرِ آب و گِل حرکت و حرارت کی مرہونِ منت ہے۔ اقبال نے سخت کوشی کے اسی مضمون کو بہ رنگِ دگر یوں بیان کیا تھا: قسمتِ بادہ مگر حق ہے اُسی ملت کا/ انگبیں جس کے جوانوں کو ہے تلخابِ حیات۔

''پیر و مرید'' میں چند اور سوال اور رومی کی طرف سے دیے گئے جوابات بھی بڑے قابلِ توجہ ہیں۔ مثلاً اقبال رومی سے سوال کرتے ہیں کہ امتیں کس بیماری کے باعث ہلاک ہو جاتی ہیں۔ رومی کا دوٹوک جواب یہ ہے: ہر ہلاکِ امتِ پیشیں کہ بود/ زانکہ بر جندل گماں بُردند عود۔ مراد یہ ہے کہ جب قومیں حق اور باطل یا ادنیٰ اور اعلیٰ میں امتیاز کی صلاحیت کھو بیٹھتی ہیں تو ہلاک ہو جاتی ہیں۔ لازم ہے کہ پتھر اور خوش بودار لکڑی (اگر) میں امتیاز کیا جائے۔ اس تمثیل کا آج کے ہمارے زوال آمادہ معاشرے پر صرف مادی حوالے ہی سے اطلاق کیجیے۔ کاروبارِ حیات میں ادنیٰ اعلیٰ کی جگہ لے چکے ہیں۔ ذہانت، میرٹ، بلند نگہی اور صداقت، کوڑے دان کی نذر ہیں اور ادنیٰ، بے شعور، نیم خواندہ، گندم نما جو فروش چونکہ اپنے قبیلے یا علاقے کے لوگ ہیں لہٰذا بلند مدارج اور مناصب پر بڑی ڈھٹائی سے فائز کر دیے جاتے ہیں۔ اقربا پروری اور خویش نوازی کے اسی چلن اور پورے وطنِ عزیز کے رگ و پے میں اترے اسی زہر کا نتیجہ ہے کہ اعلیٰ ذہانت اور میرٹ کے حامل افراد ترکِ وطن پر مجبور کر دیے گئے۔ کیا کوئی معاشرہ اس خوفناک ''برین ڈرین'' کا متحمل ہو سکتا ہے۔ کیا قوموں کی تعمیر و ترقی گھاس پھونس سے ممکن ہے اور کیا ماچس سے بجلی کا بلب روشن اور برقی پنکھا متحرک کیا جا سکتا ہے؟ ہم اس غلط فکری میں مبتلا ہیں کہ دوسرے ملکوں میں متوطن حضرات ملک کے لیے زرِ مبادلہ کماتے ہیں، ہمیں ایک لمحے کے لیے یہ خیال نہیں آتا کہ اگر ان تجربہ کار، ذہین لوگوں کو اپنے وطن میں ان کے میرٹ کے مطابق کھپایا جاتا تو یہی مٹی سونا اگلتی۔ اقبال نے کس قدر درست کہا تھا: تھا جو ناخوب بتدریج وہی خوب ہوا/ کہ غلامی میں بدل جاتا ہے قوموں کا ضمیر۔ اقبال ایک جگہ رومی سے پوچھتے ہیں کہ سوز و گداز اور علم و حکمت کی نعمتیں کیسے ملتی ہیں۔ رومی جواباً فرماتے ہیں: علم و حکمت زاید از نانِ حلال/ عشق و رقّت آید از نانِ حلال (علم اور حکمت رزقِ حلال سے ہاتھ آتے ہیں، نانِ حلال ہی سے سوز و گداز اور عشق کی نعمتیں ارزانی ہوتی ہیں)۔ نانِ حلال (اور صدقِ مقال) کی نعمت اب ہمارے معاشرے کا ایک بھولا ہوا سبق ہے لہٰذا یہاں دردمندی اور گداز کی تلاش سعیِ لاحاصل ہے۔ اب بدقسمتی سے ہمارے معاشرے کا چلن خود غرضی اور قساوتِ قلبی سے تسکین پاتا ہے۔ افراد حال مست ہیں اور اسی میں خوش ہیں۔

انفرادی و اجتماعی ضمیر کی یہ تاریکی اور قلب کی یہ قساوت ایک مدت کی غلط روی اور غلط اندیشی کا نتیجہ ہے۔ اقبال کے نزدیک اس کے کئی اسباب ہیں۔ مثلاً صدیوں پر حاوی بادشاہت، زوال آمادہ پیری مریدی اور تنگ نظر ملائیت۔ چنانچہ فرماتے ہیں: باقی نہ رہی تیری وہ آئینہ ضمیری/ اے کشتۂ سلطانی و ملائی و پیری۔ اس سلطانی نے زیادہ تر تملق و خوشامد، ملائی نے تنگ نظری اور پیری نے توہم پرستی اور رسمیت جیسے مفاسد کو مفاسد کو جنم دیا (الا ماشاءاللہ)

اقبال کے ہاں امتوں کے امراض و مفاسد ہی کا ذکر نہیں، ان کا علاج بھی معرضِ بیان میں آیا ہے۔ تفصیل کا محل نہیں، صرف چند شعر پیش ہیں: صورت شمشیر ہے دستِ قضا میں وہ قوم/ کرتی ہے جو ہر زماں اپنے عمل کا حساب۔ دل مردہ دل نہیں ہے اسے زندہ کر دوبارہ/ کہ یہی ہے اُمتوں کے مرضِ کہن کا چارہ۔ قوموں کے لیے موت ہے مرکز سے جدائی/ ہو صاحبِ مرکز تو خودی کیا ہے؟ خدائی۔ محرابِ گل کے بھیس میں اقبال نے ایک مدت پہلے ہمیں استعمار کی غلامی کے بجائے پیرہنِ چاک چاک کو ترجیح دینے کا مشورہ دیا تھا: اے مرے فقرِ غیور کیا ہے ترا فیصلہ/ خلعتِ انگیریز یا پیرہنِ چاک چاک؟ یعنی آج کے تناظر میں آئی ایم ایف کی غلامی، ورلڈ بینک کی بھیک اور عرب و امارات کی دریوزہ گری یا غیرتِ قومی۔ فیصلہ تیرا ترے ہاتھوں میں ہے دل یا شکم؟

صنفِ غزل کے بارے میں

ڈاکٹر ستیہ پال آنند

غزل ادبی قماش کی صنف ضرور ہے، لیکن من وعن، سراپا کل ادب نہیں ہے۔ ہاں، کسی حد تک اس کے ڈانڈے ادب سے ضرور ملتے ہیں، لیکن دو تین صدیوں میں سوائے اس کے اور کچھ کام نہیں ہوا کہ ترجیع و تجنیس ہو، تکرار ہو، بکرات و مرات ہو، لا محدودیت کی حد تک موضوعات اور مضامین کی جگالی کی جائے۔ لاتحصیٰ اشعار صرف ایسے ہوں جن میں یہ کوشش کی جائے کہ وہی کچھ لکھا جائے جسے انگریزی میں یوں کہا گیا ہے۔

What oft was said but never so well expresse.

لیکن اب کیا کیا جائے۔ اگر میرؔ فرما گئے ہیں:
نازکی اس کے لب کی کیا کہیے: پنکھڑی اک گلاب کی سی ہے۔۔۔۔۔اور یہ سوچ بغیر کہ میرؔ نے یہ شعر عطار کے لونڈے کے لبوں کے بارے میں کہا ہے یا واقعی ایک نازک اندام حسینہ کے بارے میں گوہر افشانی کی ہے، ہم ڈھیروں اشعار اسی مضمون اور اسی استعارے کو لے کر کہتے چلے جائیں۔۔۔ کہتے چلے جائیں۔۔۔اور کہتے چلے جائیں۔

مختصراً یہ بھی کہ چونکہ روایتی غزل گو شاعر قوافی کی فہرست بنا کر غزل کہنے کا عادی ہو چکا ہے، اسے یہ کام آسان لگتا ہے اور شاید محسوس ہوتا ہے کہ شاعری زندگی کی عمومیت سے بالاتر کچھ آفاقی قسم کی شئے ہے اور عام زندگی میں اس قسم کے موضوعات اور ان کے تحت مضامین کی کمی ہے، قلت ہے، (یقین مانئے، زندگی اس قدر پھیلی ہوئی ہے کہ مضامین کا آزوقہ کہیں نہیں دکھائی دیتا، صرف نگہٗ بینا چاہیے) زندگی کا کون سا شعبہ ہے جس میں واقعات، حادثات یا روزانہ کی مصروفیات کا قحط ہو؟ النادری، کالمعدوم کچھ بھی نہیں ہے، اس میلے میں ہر طرف تعدد ہے، مضاعف، توفیر اور بہتات کے ڈھیر لگے ہیں۔ ات گت اور بے نہایت سے البتہ اچھوتے، نوایجاد، نونیاز آمدہ مضمون کا انتخاب دیدۂ بینا کا کام ہے۔

اب ایک ایسے نکتے کو لینا ضروری ہے جس پر میں نے بہت غور وخوض کیا ہے۔ تخلیقیت کی سطح پر غزل ایک ناکام اور دوغلی صنف ہے۔ چونکہ اسے ایران سے درآمد کیا گیا اور یہ تسلیم کیا گیا کہ فارسی اساتذہ کے کلام کو آئیڈیل نمونہ تسلیم کر کے اس کا تتبع، متابعت، پیروی کرنا، اس کی مثالیں سامنے رکھ کر، ان کی تقلید اور ان کے تطابق میں شعر کہنا ہی اردو کا اوڑھنا اور بچھونا ہے، اس لیے ہندوستان میں جو اصناف سخن پہلے موجود تھیں، ان کے عروض، چھند، پنگل، زحافات وغیرہ کی طرف توجہ مبذول کرنا غیر ضروری سمجھ لیا گیا۔ اس سلسلے میں بہت کچھ لکھا گیا ہے اور میں نے خود درجنوں مضامین میں اس پر بحث کی ہے۔ ان مضامین کا ایک خلاصہ میں نے اپنی یاداشتوں کی کتاب ''کتھا چار جنموں کی'' میں بھی شامل کیا ہے۔ طوالت کے خوف کے باعث کانٹ چھانٹ کے بعد مندرجہ ذیل اقتباس پیش کر رہا ہوں۔

''غزل بطور صنف شعر اردو پر شروع سے ہی قابض رہی ہے۔ یعنی غزل اور اردو شاعری بہم دگر ایک ہی تسلیم کی جاتی رہی ہیں۔ یہ بات شاید ولی دکنی اور امیر خسرو کے وقت میں درست نہ ہو لیکن جب ہم گذشتہ تین چار صدیوں کا لکھا جو کھا کرتے ہیں تو اس حقیقت سے پیچھا چھڑانا مشکل ہو جاتا ہے کہ غزل نے پیر تسمہ پا کی طرح اردو کو ایک ہی جگہ ٹھہرنے یا ایک ہی ڈگر پر چلنے کے لیے مجبور و معذور کر دیا ہے۔

پنجاب یونیورسٹی چنڈی گڑھ میں دو اڑھائی دہائیوں کے قیام کے دوران مجھے وزیٹنگ پروفیسر کے طور پر بیرون ملک کی یونیورسٹیوں میں قیام، مطالعے، مشاہدے اور درس و تدریس کے جو مواقع میسر ہوئے، ان سے میرا یہ یقین پختہ ہو گیا کہ اگر اردو کو دنیا کی ترقی یافتہ زبانوں کے دوش بدوش کہیں بھی کھڑا ہونا ہے تو اسے اس صنف کو ایسے ہی تلانجلی دینا ہو گی، جیسے انگریزی شاعری نے سانیٹ، اوڈ، ہیرائک کپلٹ، وغیرہ اصناف سخن یا شعری اسالیب کو دی ہے۔ سانیٹ اور اوڈ کے موضوعات بھی اسی طرح سکہ بند تھے، جیسے غزل کی کلاسیکی تعریف و تفسیر ہے۔ ''بازی کردن محبوب و حکایت کردن از جوانی و حدیث محبت و عشق زنان''۔

سانیٹ میں صرف دو اقسام تھیں، ''پیٹرآرکن'' اور ''شیکسپیرین''۔ دونوں کی سطور کی تعداد بھی مخصوص تھی۔ قوافی کا چلن بھی ایسا تھا جس سے انحراف نہیں کیا جا سکتا تھا۔ موضوعات بھی سانیٹ اور اوڈ دونوں کے لیے مخصوص تھے۔ انہیں تعریف، توصیف، القاب نوازی، ممنونیت، عرضداشت، دعا یا پھر آفاقی قدروں کے اظہار و اشتہار کے لیے استعمال کیا جاتا تھا، پھر کیا وجہ تھی کہ انیسویں صدی کے نصف آخر کے بعد اور بیسویں صدی کی پہلی ربع صدی کے آنے تک یہ اصناف سخن ناپید ہو گئیں۔ اب ان کو درسی کورسوں میں تو شامل کیا جاتا ہے، لیکن شاعری کے ان جریدوں

CS CamScanner

میں جو سینکڑوں کی تعداد میں شائع ہوتے ہیں اور شعری مجموعوں میں جو ہر برس ہزاروں کی تعداد میں منظرِ عام پر آتے ہیں، یہ اصناف سخن نظر نہیں آتیں۔

میں نے یہ بات شدت سے محسوس کی کہ بلینک ورس کو اردو میں متعارف کروانے والے دیو قد شعرا راشد، میرا جی، مجید امجد اور اختر الایمان کے علاوہ دوسرے کئی ترقی پسند شعرا کی کاوشوں کے باوجود بہت سے شعرانے بھی اپنی نظموں میں غزل کی ذہنی عادت کو ترک کرنے کا مظاہرہ نہیں کیا اور غزل کے ہی پیش پا افتادہ مضامین، استعارات، تلمیحات اور گھسے بندھے امیجز کو اپنی نظموں میں بھی استعمال کرتے رہے۔ ان میں خصوصی طور پر فیض احمد فیض یا ان کے زیر اثر دوسرے نصف درجن یا اس سے بھی زیادہ شاعر شامل تھے۔ مشاعروں میں حالت اس سے بھی زیادہ بدتر تھی۔ غزلیہ شاعری اور وہ بھی ترنم سے، لہرا لہرا کر پڑھنا (گانا)، کسی بھی شعر کے مصرع اولیٰ کو ایک ماہر گلوکار کی طرح تین بار اٹھاتے ہوئے مصرع ثانی پر تان کو دھم سے 'لٹکا' یا 'جھٹکا' دے کر ختم کرنا ان کا ٹریڈ مارک بن گیا۔ اس کی انتہا یہاں تک ہوتی دکھائی دی کہ شعرا یا شاعرات کسی پروفیشنل گلوکار سے اپنی غزل کو باقاعدگی سے ''سنگیت بدھ'' کروا کر، کئی بار گھر میں آئینے کے سامنے اس کی پریکٹس کر کے مشاعروں کے لیے خود کو تیار کرنے لگے۔

''غزل ہماری شاعری کی جان ہے، روح ہے، آبرو ہے، ناموس ہے۔۔۔'' وغیرہ وغیرہ یہ الفاظ تو ہم بہت سن چکے ہیں

ان الفاظ، یعنی جان، روح، آبرو، ناموس نے ہی تو اردو شاعری کی لٹیا ڈبو دی ہے۔ کچھ آوازیں ضرور اٹھتی رہی ہیں، الطاف حسین حالی، جوش ملیح آبادی، کلیم الدین احمد، اختر الایمان، لیکن نقار خانے میں طوطی کی آواز کون سنتا ہے! میں نے ان بیس پچیس برسوں میں پندرہ سے بیس تک مضامین لکھے جو ان نیم ادبی رسائل میں شائع ہوئے جنہیں غزل گو شعرا کے علاوہ عوام الناس پڑھتے ہیں۔ا۔ ان مضامین میں میرا لہجہ نرم بھی تھا اور درشت بھی۔ میں نے بار بار مثالیں پیش کر کے، گراف بنا کر، فلو چارٹ ترتیب دے کر یا ثابت کیا کہ یہ صنف عصری آگہی سے مملو نہیں ہے اور ہو بھی نہیں سکتی۔ یہ موجودہ دور کی برق رفتار زندگی، اس کے گونا گوں تقاضوں اور بدلتی ہوئی قدروں کے اظہار کے لیے ناکافی ہے۔ اس کی تنگ دامانی مسلمہ ہے۔ یہی اعتراضات اوڈ اور سانیٹ پر بھی کیے گئے تھے اور آہستہ آہستہ شعرا خود ہی ان اصناف سے متنفر اور بدظن ہو کر کنارہ کشی اختیار کرتے ہوئے

صرف (اور صرف!) بلینک ورس شاعری کی طرف متوجہ ہو گئے تھے۔ آج جامعات کے کورسوں میں "اوڈ" یا سانیٹ ایک تاریخی عجیب الخلقت شے کے طور پر پڑھائے جاتے ہیں۔ جیسے بیسویں صدی کے پہلے ربع دور میں قریب قریب اور وسط تک پہنچتے پہنچتے ایک پوری پود پر یہ حقیقت آشکار ہو گئی کہ سانیٹ اور اوڈ کا زمانہ لد چکا، اب بلینک ورس کا دور دورہ ہے۔ بلینک ورس سے فری ورس (نثری نظم) تک پہنچتے پہنچتے کچھ برس انگریزی میں ضرور لگے، لیکن ایک بار یہ بات طے ہو گئی کہ شاعری ان جکڑ بندیوں میں نہیں پنپ سکتی جو ان اصناف کی بنیادی قدریں ہیں، تو ہو گئی۔

میں نے اپنے مضامین میں اس بات کو خود بھی سمجھا اور دوسروں کو سمجھانے کی کوشش بھی کی کہ غزل سخت جان ضرور ہے اور ہم لوگ طبعاً روایت پسند بھی ہیں، لیکن یہ ضروری ہے کہ غزل کے طریق کار کو مضمون آفرینی کے سائنسی صوتی اور لسانی پیمانوں کے علاوہ بین المتونیات کے زاویوں سے دیکھا جائے۔ مائیکل رفاترے نے اپنی تنقیدی نظریہ سازی میں شاعری میں خصوصاً اور ادبِ عالیہ کے علاوہ اساطیر میں عموماً اس کا ذکر بار بار کیا ہے، جیسے زیر آب پڑی چمکیلی چیزوں کی طرح (استعارہ مائیکل رفاترے کا ہے) انسانی ذہن اپنی تخلیقی کارکردگی کے وقت ان کے ہیولے سطح پر لے آتا ہے اور یہ مجموعی نسلی لاشعور کی وہ ''جواہرات سے جڑی ہوئی پرت'' ہے (استعارہ پھر ایک بار مائیکل رفاترے سے ہے) جسے ہم صوتی اور لسانی سطحوں پر اپنے پرکھوں سے بطور میراث لیتے ہیں او بغیر سوچے سمجھے ایسے استعمال کرتے ہیں کہ یہ تمیز کرنا دشوار ہو جاتا ہے کہ جواہرات سے جڑی ہوئی پرت صرف ایک ہیولے ہے یا در اصل ایک "شئے" ہے۔ کرسٹیوآ کے تصو"ر بین المتونیت" کو رفاترے کے تصور زیر آب پڑی ہوئی چمکیلی چیز کے ساتھ رکھ کر دیکھیں تو کلاسیکی غزل کے طریق کو باآسانی سمجھا جا سکتا ہے۔ بین المتونیت کی مثال اردو غزل سے سوا (یعنی سو فیصد حد تک) دنیا کے ادب میں کہیں اور ملنا مشکل ہے۔ ہر غزل اپنے طریق کار میں گذشتہ متون کو اسی حوالے میں لاشعوری طور پر جذب کرتی ہے اور ایسے کرتے ہوئے یہ نہیں دیکھا جاتا کہ ''کیا کہا گیا'' بلکہ یہ دیکھا جاتا ہے کہ ''کیسے کہا گیا''۔ اس ''کیسے'' میں مضمون آفرینی کے علاوہ روز مرہ اور محاورے کا استعمال، صوتیاتی مد و جذر، غنائیت اور تغزل کے علاوہ وہ چابک دستی بھی شامل ہے، جس میں استعارے سے صرفِ نظر ''شاعری بھی کام ہے آتشِ مرصع ساز کا'' کا پیمانہ استعمال کیا جاتا ہے۔

CamScanner

میرے ایک مضمون کے جواب میں کراچی سے محمد علی صدیقی صاحب اور گوہاٹی (آسام) سے تارا چرن رستوگی صاحب نے اپنے مضامین میں غزل کے دفاع میں تحریر کردہ اپنے مضامین میں وہی بات دہرائی جو دہلی میں انجمن ترقی اردو کے سربراہ اپنے تضحیک آمیز لہجے میں پہلے کہہ چکے تھے کہ مغربی تصوریوں سے آراستہ پیراستہ یہ اردو کا ''دوسرے سے بھی کم درجے کا شاعر'' کیا غزل کو ایک عیسائی میم بنانے پر تلا ہوا ہے؟ رستوگی صاحب کے ساتھ یہ جواب در جواب مضامین جب کراچی کے ایک رسالے سے جگہ بدل کر ''انشا'' کلکتہ کی زینت بننے لگے تو میں نے پھر ایک مضمون میں حوالہ جاتی لاٹھی کا سہارا لیتے ہوئے اس سانپ کے سر کو کچلنے کی سعی کی، جس نے تین چار صدیوں سے غزل کے زنگ آلود پارینہ خزانے کو اپنی تحویل میں لے رکھا تھا۔ میں نے لکھا،

''ہم سب جانتے ہیں کہ مضمون کی بنیاد استعارہ ہے، لیکن اردو غزل کے طریق کار میں استعارہ صرف ایک Paradigmatic Base ہی نہیں، بلکہ یہ اس بنیاد پر Syntagmatic بھی ہے۔ مغرب میں شعری طریق کار کا چلن یہ ہے کہ وہ استعارے کو صرف ایک "شئے" نہ فرض کرتا ہوا، اس کے بجائے اس کی برابری میں ایک "ہیولے" کو فرض کر کے استعمال کرتا ہے، لیکن غزل میں یہ قائم مقام بدل کا سلسلہ در سلسلہ بنتا چلا جاتا ہے۔ ایک چارٹ بنا رہا ہوں۔

مضمون محبت کرنا Pradigmatic

استعارہ: محبت میں گرفتار ہونا (گرفتاری، مجبوری، آزادی کا فقدان وغیرہ)

Syntagmatic استعارے: چمن، قفس، صیاد، طائر، دام، بال و پر، شکستگی، آشیاں، پر پرواز کا کاٹ دینا، برقِ تپاں، آتش زدگی، ، طوفان باد و باراں، آسمان، تیر کمان وغیرہ۔ syntagmatic Sub استعارے: قفس، روداد چمن، ہمدم، اور درجنوں دیگر ذیلی استعارے اگر بری سفر کا استعارہ ہو گا، تو دشت، طوفان، تشنگی، کانٹے، پاؤں کے چھالے، کارواں، میر کارواں، محمل، گرد و غبار، ''بوعلی''، قزاق، وغیرہ ذیلی استعارے پیادوں کی طرح ہمراہ چلیں گے۔ اسی طرح اگر بحری سفر کا استعارہ ہو گا تو طوفان، کشتی، سفینہ، جہاز، لنگر، بادبان، ناخدا، تلاطم، کنارہ، ساحل اور درجنوں دیگر ذیلی استعارے ڈگمگاتے ہوئے ساتھ چلتے جائیں گے۔

ترقی پسند تحریک کے وقت پہلے تو ان استعاروں سے اجتناب برتا گیا اور شعرا پر دباؤ ڈالا گیا کہ وہ ان سے دور ہیں۔ جگر مراد آبادی جیسے تغزل اور ترنم کے شاعر نے بھی یہ مصرع کہنے پر خود کو راضی کر لیا، ع: شاعر نہیں ہے وہ جو غزل خواں ہے آج کل۔ لیکن جب فیض نے اپنی نظموں اور غزلوں میں یہی استعارے ایک نئے سیاق میں، یعنی اشتراکیت کے حوالے سے برتنے شروع کیے تو جیسے غزل گو شعرا سے بھی یہ پابندی اٹھ گئی۔ مجروح کا یہ مصرع ثبوت کے لیے کافی ہے۔ ع اٹھ اے شکستہ بال، نشیمن قریب ہے۔

بلراج کومل صاحب یکتائے روزگار شاعر تھے۔ ان سے جتنی بار دہلی میں بات چیت ہوئی یا جب وہ ایک بار چنڈی گڑھ تشریف لائے، انہوں نے مجھ سے اتفاق کیا کہ تین یا اس سے بھی زیادہ صدیوں تک یہ استعارات جو عجمی غزل سے مستعار لیے گئے تھے، اردو غزل پر اپنا سکہ جمائے ہوئے ہیں۔ ان دوران میں ان استعارات کا تبادل کی سطح پر، یا "ایک برابر ہے ایک کے" کے تناظر میں تصویری پہلو عنقا ہو گیا۔ یعنی محفل یا مشاعرے میں بری یا بحری سفر (دشت، قافلہ، قافلہ سالار، محمل، ناقہ، گرد پس کاروان، قزاق، رہبر، گم رہ منزل، یا کشتی، طوفان، ناخدا، ساحل، منجدھار، لنگر، بادبان وغیرہ) پر مبنی syntagmatic & sub sntagmatic استعارات کو سن کر سامعین کے ذہن میں کوئی تصویر اجاگر نہیں ہوتی۔ یہ حالت یہاں تک دگرگوں ہو گئی کہ غزل گو شعرا ان ذیلی استعاروں کے فاضل پرزوں (سپیئر پارٹس) کو اپنے ذہن کے کارخانوں کے شیلفوں پر رکھے ہوئے بآسانی اٹھا کر کسی بھی شعر میں جڑ دیتے۔ آج تک اردو میں جو لاکھوں کروڑوں غزلیں لکھی گئی ہیں، ان میں سے ننانوے فیصد اشعار اسی قماش وقبیل کے ہیں اور اس میں دو آرا نہیں ہو سکتیں۔

جن احباب نے میرے ان خیالات سے اتفاق کیا ان میں گیا (بہار) کے کلام حیدری بھی تھے، اور سری نگر کے پروفیسر حامدی کاشمیری تھے جو ابھی شعبہ اردو کے سربراہ تھے اور اس یونیورسٹی کے وائس چانسلر نہیں ہوئے تھے۔ اُن سے دو تین خطوط کے تبادلے میں ہی یہ صورتحال زیادہ واضح ہو گئی۔ اب یہ خطوط تو میرے سامنے نہیں ہیں، لیکن اس امر کے باوجود کہ وہ خود غزل کہتے ہیں، ان کا خیال تھا کہ سب یورپی زبانوں میں ہر نیا دور اپنے استعارے اپنے ساتھ لاتا رہا ہے لیکن بوجوہ اردو میں یہ نہیں ہوا اور ہم لکیر کے فقیر کی طرح چلتے ہوئے دائروں میں گھومتے رہے ہیں، یہاں تک فیض احمد فیض اور ان کے پیروکاران استعاروں کے سوکھے چھلکوں سے بائیں بازو کی سیاست کا نیا رس نچوڑنے کا جتن کرتے رہے ہیں۔ لیکن کسی کو یہ خیال نہیں آیا کہ ہر استعارے کے

تصویری پہلو کو صرف عصری زندگی کے تناظر میں ہی رکھ کر دیکھا جا سکتا ہے۔ یہ وجوہ کیا تھیں ان میں ایک بار پھر جانا مناسب نہیں ہے، لیکن صرف اتنا کہنا ہی کافی ہے کہ ہم نے اردو غزلیہ شاعری میں ہمیشہ خود کو دوسرے نمبر کا شہری سمجھنے پر ہی اکتفا کیا ہے۔ اگر غالب جیسا زمانہ ساز شاعر بھی اپنے فارسی دواوین کو اردو دیوان پر فوقیت دے سکتا ہے (اور یہ انیسویں صدی کے نصف آخر کی بات ہے) تو دیگر شعرا کا ذکر ہی کیا؟

میں نے اپنے نصف درجن کے مضامین میں اس حقیقت کا ذکر کیا کہ آج تک ہم اٹھارھویں صدی عیسوی کے انگریزی شاعر الیگزنڈر پوپ کو ہیرائک کپلٹ یعنی قافیہ بند اشعار کا کامیاب ترین شاعر تسلیم کرتے ہیں۔ اس کی کچھ نظموں میں، جو سینکڑوں اشعار کا مرقع ہیں، پچاس یا اس سے بھی زیادہ قسم کے قوافی کا استعمال کیا گیا ہے۔ حروف ابجد کی تعداد کے حساب سے ان قوافی میں ہر بار صرف آخری دو حروف یعنی ایک حرفِ صحیح اور ایک حرفِ علت کے انسلاک سے قافیے کی تشکیل کی گئی ہے۔ میں نے اپنے برٹش اوپن یونیورسٹی کے دنوں میں جب انگلستان میں مقیم ہندوستانی یا پاکستانی طلبہ کے لیے ایک کورس کی تشکیل کرتے ہوئے غزل میں قوافی کے طریق کار اور انگریزی میں ہیرائک کپلٹ کی روایت پر غور کیا تو مجھے اچنبھا ہوا کہ پوپ یا اٹھارھویں صدی عیسوی میں ہی انگریزی کے دیگر شعرا کے ہاں صرف ایک ہی چلن ہے، یعنی آخری لفظ جو صرف دو یا تین آوازوں سے متشکل ہو، اسے ہی قافیہ بند کیا جائے، جیسے: last/ leave:nor/for:fuse/ruse:fast/ weave:bold/sold وغیرہ، جب کہ ہمارے ہاں غزل میں یہاں تک آزادی ہے کہ صرف ایک آخری حرف علت، الف (ممدودہ اور مقصورہ)، "ہ" (ہائے مختفی یا ہائے ہوز)، "ی ؟ ے" (یائے معروف اور یائے مجہول کا قافیہ بھی ممکن ہے، اور چار یا پانچ یا اس بھی زیادہ حروف سے متشکل الفاظ بھی قافیہ پیمائی میں استعمال کیے جا سکتے ہیں۔ اس سے جہاں غزل میں ایک صوت کے سبھی قافیے لانے کی پابندی ہے، (جو کہ ہیرائک کپلٹ میں نہیں ہے) وہاں یہ آسانی بھی ہے، کہ اگر آپ کسی "مصرع طرح" پر غزل موزوں نہیں کر رہے ہیں، تو آپ کسی بھی ایسی زمین کا انتخاب کر سکتے ہیں، جس میں قوافی کو صرف ایک آخری حرف علت کی صوت کو ہر مصرع ثانی میں یکساں رکھ کر، صوتی ہم آہنگی قائم رکھتے ہوئے اشعار گڑھے جا سکتے ہیں۔

مضمون آفرینی کے بارے میں بلراج کومل صاحب (مرحوم) کے الفاظ میری ڈائری میں درج ہیں، انہوں نے کہا کہ ہر دس بارہ برسوں کے بعد شعرا کی ایک تازہ پود کچھ استعارے میل جول سے ترتیب دے لیتے ہیں جو دیکھنے یا سننے میں کانوں کو تازہ دم اور تازہ کار محسوس ہوتے ہیں لیکن ان کی روح اصل وہی اسی پرانی جڑ سے شاخ در شاخ پھوٹتی ہے۔ ان کے ساتھ یہ نکتہ بھی زیر بحث آیا کہ مضمون آفرینی چونکہ غزل کی بنیادی صفت ہے، یہ جاننا ضروری ہو گا کہ غزل کے کسی شعر کو بھی مضمون کے چوکھٹے میں رکھ کر دیکھا جائے۔ لیکن "شعر" اپنے آپ میں "مضمون" سے مختلف ہوتا ہے۔ یعنی "معنی" اور "مضمون" دو الگ الگ اجناس ہیں۔ مغربی شاعری کے طریق کار میں یہ تفریق نہیں ملتی ہے۔

طاق پر رکھی ہوئی چند کتابوں کی طرح
عمر بیتی گئی بے ربط حوالوں کی طرح
کیا اغیار نے دھوکہ تو کبھی اپنوں نے
دل نے رکھے ہیں بھرم بھولنے والوں کی طرح
میں تری راہ میں پلکوں کو بچھاتی کیسے؟
تو نے چاہا ہی نہیں چاہنے والوں کی طرح
میرا دامن بھی مرے دِل کی طرح خالی ہے
بَس تری آس میں ہوں درد کے ماروں کی طرح
کچھ کہوں بھی تو مرے لفظ کہاں کافی ہیں
تیرے اسرار ہیں بے مہر خیالوں کی طرح
اس جہاں میں مری ہستی کا کوئی مول نہیں
دفن کر دو مجھے بے دام خزانوں کی طرح

سُمبل معراج/امریکا

چند ایک مسافر بھی مرے سنگ چلے ہیں
ہم، آرزوئیں ساتھ لیے جھنگ چلے ہیں
ہم عشق سے گوندھی ہوئی مٹی کی مہک کو
ترسے تھے سو اب، خطہ نورنگ چلے ہیں
بے رنگ مناظر تھے، تخیل کے جہاد کے
قوسِ قزح خلد سے کچھ رنگ چلے ہیں
اک کُن پہ جو تیری مرے معبود، بنے تھے
حکمت پہ ہی تیری مرے ارژنگ چلے ہیں
اے مہر و مروّت کے خدا تیرے جہاں میں
روتے ہوئے آئے تھے اور دنگ چلے ہیں
ان میں مکاتیب کا کچھ کر مرے مالک
جو میری طرف سے تجھے بے رنگ چلے ہیں
سننے میں یہ آیا ہے کہ طوفان کے لشکر
کرنے کو کسی دیپ سے پھر جنگ چلے ہیں

شہزاد دیپ/جھنگ

ہزارہ میں آپ بیتی کی روایت عظیم ناشاداعوان کی اہم تحقیقی کاوش

قمر زمان/ایبٹ آباد

اردو نثر کی غیر افسانوی اصناف میں آپ بیتی بڑی اہمیت کی حامل صنف ہے۔اپنے نفسِ مضمون کے اعتبار سے یہ سب سے مقبول صنف ہے، جو کسی شخص کی انفرادی رودادِ حیات ہونے کے ساتھ ساتھ اس کے عہد کی سیاسی وسماجی تہذیبی وثقافتی زندگی کی آئینہ دار بھی ہوتی ہے۔جس میں انسانی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو مختلف اسالیب کے ذریعے پرویا جاتا ہے۔آپ بیتی مشرق ومغرب میں عہد قدیم سے کسی نہ کسی صورت میں موجود ہے۔تاریخ وسوانح کا آپس میں گہرا تعلق ہے اس لیے یہ کئی اہم تاریخی واقعات کی بھی آئینہ دار ہوتی ہے۔یہ خودنوشت بھی کہلاتی ہے۔آپ بیتی کو بیانیہ اور نیم تخلیقی صنفِ ادب قرار دیا جاتا ہے وہاج الدین علوی نے آپ بیتی یا خودنوشت کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے کہ

خودنوشت سوانح حیات ادب کی وہ تخلیقی صنف ہے جو کسی فردِ واحد کی زندگی کے عام ادوار پر محیط ہوتی ہے اور اسی کے قلم کی رہین منت ہوتی ہے جس کے آئینہ میں اس شخص کی داخلی/خارجی زندگی کا عکس براہ راست نظر آتا ہے اور اس عہد کا بھی جلوہ گر ہوتا ہے۔

آپ بیتی کی اسی خوبی کے پیشِ نظر یہ دنیا بھر کی زبانوں میں اہم صنف سمجھی جاتی ہے۔اردو میں آپ بیتی کی روایت تقریباً ڈیڑھ سو سال پرانی ہے۔اردو میں اس کی ابتدا جعفر تھانیسری کی آب بیتی تاریخ عجیب (کالا پانی) سے ہوتی ہے جس کی اشاعت 1879ء میں ہوئی۔اس آپ بیتی میں انگریز دور کے اہم حالات وواقعات بیان کیے گئے۔اردو میں اس کی روایت بہت مضبوط ہے ہر شعبہ زندگی کے اہلِ قلم کی لکھی ہوئی کئی بے مثال آپ بیتیاں منصۂ شہود پر آ چکی ہیں۔ہزارہ میں آپ بیتی کی روایت زیادہ قدیم نہیں ہے تاہم یہاں کئی اہم آپ بیتیاں سامنے آئی ہیں۔ملک عظیم ناشاداعوان نے اپنے تازہ تحقیقی وتالیفی کارنامے ہزارہ میں آپ بیتی کی روایت میں اس اہم موضوع پر دادِ تحقیق دی ہے۔عظیم ناشاد اعوان کا تعلق ضلع مانسہرہ سے ہے جہاں وہ تدریس کے شعبے سے وابستہ ہیں۔اس کے ساتھ ساتھ وہ ایک متحرک ادیب وشاعر کے طور پر فروغِ ادب کے لیے خدمات انجام دے رہے ہیں۔ہزارہ میں آپ بیتی کی روایت میں اردو، انگریزی اور ہندکو زبان میں لکھی جانے والی تینتیس (33) آپ بیتیوں پر حاشیہ آرائی کی گئی ہے۔اس طرح ہزارہ میں اردو انگریزی اور ہندکو زبان میں لکھی جانے والی آپ بیتیوں کا مکمل احاطہ کیا گیا ہے۔ان آپ بیتی نگاروں میں ہر شعبہ زندگی کے افراد شامل ہیں۔اس ضمن میں صدر ایوب خان، ایئر مارشل اصغر خان، گوہر ایوب خان اور قتیل شفائی جیسے عالمی شہرت یافتہ افراد سے لے کر عام آدمی تک کی آپ بیتیاں شامل ہیں۔
ایون خان کی جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی اگر سیاسی واقعات سے پر ہے تو کموڈور محمد الیاس خان کی بحر وبر اور میجر مترل ڈاکٹر مسعود الرحمٰن کیانی کی کیانی کہانی عسکری واقعات کا مرقع ہے۔
معروف ڈینٹل سرجن پروفیسر ڈاکٹر ایم اے صوفی کی یادیں اور ملاقاتیں سیاسی وسماجی اور انتظامی امور کو زیرِ بحث لاتی ہے۔غلام مجتبیٰ عامر کی آپ بیتی نقوشِ زیست ریڈیو کی دنیا کی سیر کراتی ہے تو عبدالوحید خان کی سب ورق تیری یاد کے ہمیں پردیس میں زندگی کے تلخ حالات وواقعات سے آگاہ کرتی ہے۔انھی آپ بیتیوں میں ریحام خان کی متنازعہ آپ بیتی بھی دکھائی دیتی ہے، غرض عظیم ناشاداعوان نے اپنی کتاب کے ذریعے زندگی کے مختلف رنگوں کو اجاگر کرتی ان خوب صورت آپ بیتیوں کو یکجا کر کے قاری کو زندگی کے مختلف رنگوں سے آشنا کیا ہے۔عظیم ناشاداعوان کی اس کتاب کے مطابق محمد خواص خان گولڑہ کی سرگزشت پریشاں اشاعت 1963ء ہزارہ کی سب سے اولین آپ بیتی کے طور پر سامنے آتی ہے۔خواص خان کا شمار ان بزرگوں میں ہوتا ہے جنھوں نے ہزارہ میں ادب کی رویت کو پروان چڑھانے میں اپنا کردار ادا کیا۔انہوں نے گل دستۂ شعرائے پکھلی جیسی اہم دستاویز بھی مرتب کی ہے۔اسی طرح کئی دیگر اکابرین کی آپ بیتیوں کا تذکرہ ملتا ہے جو کسی نہ کسی حوالے سے ہزارہ کی شہرت کا باعث بنے۔بحیثیت مجموعی ان آپ بیتی نگاروں میں سیاستدان، شاعر وادیب، علماء، بیوروکریٹ، ڈاکٹر، براڈ کاسٹر، مسلح افواج کے افراد اور سماجی کارکن اور عام لوگوں کے نام شامل ہیں۔
عظیم ناشاداعوان نے نہ صرف ان آب بیتیوں کو ایک جگہ جمع کیا ہے بلکہ ان کا تجزیاتی مطالعہ بھی کیا ہے۔
اس کے ساتھ ساتھ مصنفین کے مختصر حالات زندگی بھی تحریر کیے ہیں اس طرح قاری ہر مصنف کے حالات زندگی سے بھی آگاہ ہوتا ہے۔عظیم ناشاداعوان کے ان تجزیات سے ان تمام آب بیتیوں کی اہمیت بھی اجاگر ہوتی ہے۔ان آب بیتیوں میں لکھنے والوں کی ذاتی زندگی کے حالات و واقعات، جذبات و

احساسات کے ساتھ ساتھ ان کے عہد کی ایک عمدہ تصویر بھی قاری کے سامنے آ جاتی ہے۔ان کے عہد کی سیاسی وسماجی اور ثقافتی زندگی کے کئی رنگ ان آپ بیتیوں میں بکھرے پڑے ہیں۔ان کے ذریعے کئی تاریخی واقعات اور انکشافات بھی سامنے آئے ہیں۔عظیم ناشاد اعوان نے بڑی محنت اور عرق ریزی سے اس اہم موضوع پر مطلوبہ مواد یکجا کیا اور اس کو ترتیب دے کر کتابی صورت میں شائع کیا ہے۔انہوں نے آنے والے محققین کے لیے ایک اہم سہولت مہیا کر دی ہے۔ ہزارہ کے نامور محقق شاعر و ادیب پروفیسر بشیر احمد سوز کے نقش قدم پر چلتے ہوئے عظیم ناشاد اعوان نے ہزارہ کے ادبی سرمائے میں اہم اضافے کیے ہیں گزشتہ برسوں میں انہوں نے تسلسل کے ساتھ تحقیقی وتالیفی میدان میں اپنا سفر جاری رکھا ہے۔زیرنظر کتاب میں انہوں نے ہزارہ میں اب تک لکھی جانے والی اردو،انگریزی اور ہندکو آپ بیتیوں کو اکٹھا کر کے ان کا ایک گلدستہ بنا دیا ہے۔اردو اور انگریزی کے ساتھ ساتھ ہندکو کی اولین آپ بیتی یاداں دی کہانڑیں کا تذکرہ بھی اس کتاب میں موجود ہے جس کو لکھنے کا اعزاز بھی عظیم ناشاد اعوان کو ہی حاصل ہے۔اس آپ بیتی کا تذکرہ بھی زیرنظر کتاب میں شامل ہے۔ ہزارہ میں شائع ہونے والی آپ بیتیوں سے متعلق جس قدر مواد مہیا ہو سکتا تھا عظیم ناشاد اعوان نے وہ اکٹھا کیا ہے اس کے علاوہ انہوں نے کچھ زیرطبع بیتیوں کی نوید بھی سنائی ہے یوں اس کتاب کو ہزارہ میں آپ بیتیوں کا انسائیکلوپیڈیا کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔یہ کام اگر سندی تحقیق کے طور پر کیا جاتا تو یقینی طور پر عظیم ناشاد اعوان پی ایچ ڈی نہ سہی تو کم از کم ایم فل کی سند کے ضرور حق دار تھے۔مجموعی طور پر یہ ان کی ستائیسویں کتاب ہے انہوں نے اس سے قبل متنوع موضوعات پر چھبیس (26) کتب تصنیف وتالیف کی ہیں۔ان کے موضوعات میں رنگا رنگی پائی جاتی ہے۔ان میں سوانح عمریاں، تاریخ و تہذیب، اعوان قوم کا ماضی حال و مستقبل، شعراء کا گلدستہ، ہزارہ کا جغرافیہ، انساب اور اقبالیات خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔زیرنظر کتاب کے حوالے سے ڈاکٹر منصف خان سحاب، قاضی اعجاز احمد اور پروفیسر سمینہ زیب کی وقیع آرا بھی کتاب میں شامل ہیں۔اس کتاب کی ایک اہم خوبی اس میں دیے گئے حوالہ جات ہیں جن سے قاری خود بھی استفادہ کر سکتا ہے اور حالات و واقعات کی صحت کی جانچ کر سکتا ہے۔یہ کتاب سلیس وسادہ اور رواں زبان میں لکھی گئی ہے۔عظیم ناشاد اعوان نے ہزارہ کے لیے جتنی تصنیفی اور تالیفی خدمات انجام دی ہیں وہ لائق تحسین ہیں۔ہزارہ میں مجموعی طور پر شعری ادب پر زیادہ لکھا گیا ہے ہے نثری ادب پر توجہ کم رہی ہے، تاہم پچھلے کچھ برسوں سے کئی اہم نثری تخلیقات بھی تواترے ساتھ سامنے آئی ہیں۔جن اہلِ قلم نے اس حوالے سے تسلسل کے ساتھ کام کیا ہے ان میں عظیم ناشاد اعوان خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ان کی زیرِ نظر کتاب بھی اس سلسلے کیا ہم کڑی ہے۔ہزارہ میں آپ بیتی کی روایت کے ذریعے اس خطے میں لکھی جانے والی اہم آپ بیتیوں کی روایت کو ایک دستاویز کے طور پر محفوظ کرنا عظیم ناشاد اعوان کی ایک اہم تحقیقی کاوش ہے جو بعد میں آنے والوں کے لیے ایک مشعلِ راہ ثابت ہوگی۔اس خوب صورت کتاب پر وہ بجا طور پر مبارک باد کے مستحق ہیں۔کتاب 2025ء میں ممتاز پبلی کیشنز لاہور سے شائع ہوئی ہے۔

ایک سناٹا ہے گھر پر میرے
اُڑ گئے خواب کبوتر میرے
بول سکتی نہیں اپنے حق میں
ہونٹ سِل جاتے ہیں اکثر میرے
سوچ اُڑنے کا ابھی سوچتی ہے
کاٹ دیتا ہے کوئی پر میرے
سونی رہ جاتی ہے تصویر مری
رنگ مر جاتے ہیں اندر میرے
ریت ہی ریت ہوئے جاتے ہیں
میرے دریا ، یہ سمندر میرے

لبنیٰ صفدر/لاہور

شہرِ اجداد کو بہت روئے
خستہ بنیاد کو بہت روئے
دستیابی کے بعد ہم دونوں
لذتِ یاد کو بہت روئے
خالی جھولی کو دیکھ کر عاصی
پھیکی فریاد کو بہت روئے
پیڑ پنچھی کھلا ہوا پنجرہ
بوڑھے صیاد کو بہت روئے
اک مصیبت ہے یہ رہائی بھی
قیدی آزاد کو بہت روئے
کھلکھلائے نجف کی گلیوں میں
اور بغداد کو بہت روئے
جس کا بازار آنا جانا ہو
مولا سجاد کو بہت روئے

اسد رضا سحر

عودنگر کی خوشبو

سرور حسین نقشبندی/ لاہور

محترم جسٹس (ر) میاں نذیر اختر اپنے نرم و گداز لہجے، دھیمے و پُر اثر مزاج اور نورانی و متانت آمیز چہرے کے ساتھ اہلِ محبت میں جانے جاتے ہیں۔ داتا گنج بخشؒ کے عرس پر ہونے والے سالانہ مشاعرہ منقبت میں ان سے عرصہ دراز سے ملاقات ہوتی چلی آرہی ہے۔ میرے لیے ان کا اپنا شعری نعتیہ مجموعہ بہت چونکا دینے والا ہے۔ شاعری کے حوالے سے کہا جاتا ہے کہ یہ فطری طور پر انسان کے اندر موجود ہوتی ہے۔ کسی میں شعر کہنے کی صلاحیت نہ ہو تو پیدا نہیں کی جاسکتی ہے جیسے اچھی آواز بھی قدرت کا عطا کردہ انعام ہے جسے محنت سے سنوارا اور نکھارا جاسکتا ہے لیکن اگر آواز نہ ہو تو آج کل کی جدید میڈیکل سائنس اور ٹیکنالوجی کسی بھی طور یہ صلاحیت پیدا نہیں کرسکتی۔ قدرت کا پیدا کردہ ہر جوہر، اپنے اظہار کے راستے خود متعین کرتا چلا جاتا ہے اور اسے کسی طور بھی مخفی رکھنا ممکن نہیں ہوتا۔ صاحبِ کتاب کا عمر کے اس حصے میں ایک پورا مجموعہ سامنے آجانا میرے لیے بہت حیران کن ہے کہ انہوں نے اپنی اس قدرتی صلاحیت کی اپنے انتظامی اُمور سے منسلک عرصے کے دوران کسی کو ہوا تک نہیں لگنے دی۔ ان کی نعتیہ شاعری کے ایک سرسری مطالعے کے بعد اُبھرنے والے ابتدائی تاثر میں یہ بات سامنے آتی ہے کہ ان کے طرزِ اظہار میں روانی ہے اور سلاست بھی، نغمگی ہے اور گداز بھی، شعری اظہار کا قرینہ ہے اور اس کو برتنے کی بھرپور صلاحیت بھی۔ عمومی شاعری کی نسبت حمد و نعت کا معاملہ بہت زیادہ حساس ہوتا ہے اور احتیاط کا متقاضی بھی جس کے پے در پے نمونے ''عودنگر'' میں جلوہ ریز ہیں۔ سب سے بڑھ کر جابجا قرآنی آیات سے بھرپور استفادہ ان کے تبحرِ علمی اور وسیع مطالعے کی گہرائی کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔ نعت گو شعراء کے ہاں کہیں کہیں اس کی جھلک ضرور نظر آتی ہے۔ لیکن یہاں ان کے کلام میں کہیں آیات کے مفاہیم جگمگا رہے ہیں، کہیں آیت کا جزو، شعر کی توقیر بڑھا رہا ہے اور کہیں کوئی ایک قرآنی لفظ پورے مصرعے کے حُسن کو چار چاند لگا رہا ہے۔ بعض اوقات تو ایک کلام میں ہی چھ سے سات اشعار میں اس کا ظہور ہو رہا ہے اس کی وجہ وہ خود بیان کرتے ہوئے ایک شعر میں کہتے ہیں کہ ہر صاحبِ ایمان قاریِ قرآن کو کلام مجید کی آیات ہی نعت کے جلوے دکھانے لگ جاتی ہیں:۔

جو بھی مومن کرے قرآں کی تلاوت اختر
اس کو آیات ملیں نعتِ نبیؐ کی صورت

سورۃ الذاریات آیت نمبر 56 میں جن و انس کی پیدائش کے مقصد کو بیان کیا گیا ہے جس کا منظوم ترجمہ دیکھیے:۔

عبادت کریں اس کی جنات و انساں
اسی واسطے سب بنائے خدا نے

سورۂ حجرات کی آیت 13 کا من و عن مفہوم دیکھیے:۔

تعارف ہے مقصود نوعِ بشر کا
جو قوموں قبیلے بنائے خدا نے

کچھ قرآنی آیات کے الفاظ ایسے بھی ہیں جو شاعری میں شائد پہلی بار استعمال کیے گئے ہیں جیسے سورۂ انبیاء کی آیت 30 کے یہ الفاظ دیکھیے:۔

زمیں ''رَتق'' پہلے سماوات سے تھی
''فتق'' کے نظارے دکھائے خدا نے

عربی زبان میں ''رتق'' کا معنٰی ہے ''ملا ہوا ہونا'' اور ''فتق'' سے مراد ہے ''جدا کرنا یا علیحدہ کرنا''۔

جسٹس صاحب بنیادی طور پر صوفی مزاج آدمی ہیں۔ تصوف کو محض تقلید کی حیثیت سے نہیں بلکہ تعلیم کی سطح پر جانتے ہیں۔ اپنی ایک حمد میں کتنی سہولت سے یہ شعر کہہ گئے ہیں:۔

سب انوار ذاتی چھپائے خدا نے
وجودِ شہودی دکھائے خدا نے

تاریخی اعتبار سے نعت کہنے کا آغاز کیسے ہوا؟ اس کو ان چار مصرعوں میں سمو کر گویا کوزے میں سمندر بند کر دیا گیا ہے:۔

کرنے لگے سرکارؐ کی جب ہجو قریش
اس ظلم پہ لازم ہوا اقدام جوابی
سرکارؐ نے حسانؓ کو سونپا یہ فریضہ
جبریلؑ مدد ان کی کرے حق سے دعا کی

یہ دونوں اشعار بخاری شریف کی حدیث نمبر 453 جلد 1 ص 277 کا مفہوم بیان کر رہے ہیں۔

نعت پیغامِ سیرت کو عام کرنے کا بہترین ذریعہ ہے۔ یہ صرف شاعری نہیں بلکہ نعت کہنے والا اس کی روح کو سمجھ کر ایک مبلّغ کی حیثیت سے خدمات سرانجام دے سکتا ہے۔ ان اشعار میں دیکھیے:۔

علم کی شمعیں جلا دینا بھی انؐ کی نعت ہے
جہل کی ظلمت مٹا دینا بھی انؐ کی نعت ہے
بخش دینا سنگ باری کرنے والوں کو ہے نعت
اپنے اعداء کو دعا دینا بھی انؐ کی نعت ہے
نعت ہے لفظوں میں توصیفِ نبیؐ کرنا بیاں
وصف کو سیرت بنا دینا بھی انؐ کی نعت ہے

دیدارِ مصطفیٰ ﷺ کی خواہش کے مضامین تو

نعت نگاروں کے ہاں ضرور موجود ہوتے ہیں لیکن یہ قرینہ خال خال ہی نظر آئے گا:۔

انؐ کے دیدار سے پہلے یہ کرم ہو مولا
انؐ کے دیدار کے قابل مجھے آنکھیں دے دے

نعت میں استغاثہ کی روایت بہت مضبوط اور توانا ہے۔ مدحت نگاروں نے اُمت کے احوال کا ایسا ایسا درد بارگاہِ رسالت مآب ﷺ میں نعت کی صورت میں پیش کیا ہے جو ہماری نعتیہ تاریخ کا ایک روشن اور تابندہ باب ہے۔ ''عودنگر'' کے شاعر کا رنگِ التجا و مناجات اپنے اندر اجتماعیت کا رنگ لیے ہوئے ہے۔ جس میں مسلمانانِ عالم کی حالت زار کا اظہار ہے اور اس پہ گریہ وزاری بھی، حضور ﷺ سے چشمِ کرم کی گزارش ہے اور عظمتِ رفتہ کی بحالی کا سوال بھی، دین کا درد اور اس کی سچی محبت، اسلام کے پرچم کو عالم پر لہراتا ہوا دیکھنے کی خواہش میں ڈھلتی محسوس ہوتی ہے:۔

مسلماں ہیں رہینِ ظلمِ دوراں یا رسولؐ اللہ
کھڑے ہیں آپ کی چوکھٹ پہ گریاں یا رسولؐ اللہ
مدد اللہ کی کب آئے گی؟ اُمت سوالی ہے
ہوا مشکل بچانا اب تو ایماں یا رسولؐ اللہ
عطا ہو پھر مسلمانوں کو ان کی عظمتِ رفتہ
زمانے بھر میں پھیلے نورِ ایماں یا رسولؐ اللہ
عَلَم اسلام کا دنیا کے ہر خطے پہ لہرائے
بنیں عالم کے پھر رہبر مسلماں یا رسولؐ اللہ

عقیدۂ ختمِ نبوّت نعت کا ایک بہت اہم موضوع ہے۔ عہدِ موجود میں اس کی ضرورت واہمیّت بہت بڑھ گئی ہے۔ ہمارے نعت نگاروں کو اس طرف توجہ دیتے ہوئے حضور ﷺ کے مرتبے کے اس پہلو کو اُجاگر کرنے کی بہت ضرورت ہے۔ صاحبِ کتاب کی آواز یہاں آ کے اور توانا، مستحکم اور بااعتماد محسوس ہوتی ہے جس نے ان سے یہ اشعار کہلوائے ہیں:۔

دروازہ خود جو بند نبوّت کا رب کرے
کذاب ہے جو دعویٰ نبوّت کا اب کرے
جاری رہے گی دائم سرکارؐ کی نبوّت
تا حشر اب یہ منصب کوئی نہ پائے گا
لکھی گئی لہو سے وہ ایسی کتاب ہے
جنگِ یمامہ ختمِ نبوّت کا باب ہے
ثابت کیا عمل سے صحابہ کرامؓ نے
کرنا جہاد حُبِّ نبیؐ کا نصاب ہے
وہ شخص تو پڑا ہے بڑی سخت بھول میں
کہتا ہے وہ نبی بنا حُبِّ رسولؐ میں
لا ریب لاکھ نعمتیں ملتی ہیں آپؐ سے
ملتی نہیں نبوّتیں عشقِ رسولؐ میں

موئے مبارک کے موضوع پر بھی ان کے کہے ہوئے موضوعاتی اشعار بہت خوبصورت ہیں:

عطائے موئے مبارک باعثِ صد سعادت ہے، ایک شعر میں شاعر نے اس حقیقت کو بیان کیا ہے کہ اس کی طلب تو بہت تھوڑی تھی لیکن قسمت نے یاوری کی تو اسے عظیم نعمت موئے مبارک کی صورت میں عطا ہوئی۔

میں طالبِ یک ذرّۂ فردوسِ مدینہ
جاگا جو نصیبہ تو ملا موئے مبارک

ایک اور شعر بہت چونکا دینے والا ہے جس میں ایک بالکل نئے پہلو یعنی موئے مبارک کی خدمت کر کے اپنا نام خدام میں لکھوانے کا اعزاز حاصل ہو جانے کا ذکر کیا گیا ہے:۔

یوں شاملِ خدامِ نبیؐ ہو گیا اخترؔ
خدمت تری اعزاز مرا موئے مبارک

کتاب کا نام جس شعر سے لیا گیا ہے یہ صاحب کتاب کے تخیل میں انعام کی صورت میں اُتارا گیا ہے۔ نعت صدیوں سے کہی جارہی ہے لیکن آج بھی جب کوئی کاسۂ فن لے کر جادۂ مدحت پہ رواں ہوتا ہے تو اس کے دامن میں کچھ نہ کچھ ایسا ضرور ڈال دیا جاتا ہے جو صرف اسی کا حصہ ہوتا ہے اور یہی اعجاز وافتخار نعت ہے۔ مدینہ منورہ کے لیے ''عودنگر'' کا نام کم از کم میرے محدود مطالعے سے نہیں گزرا۔ یہ شعر کتاب کا حاصل اور صاحب کتاب پہ انعام کی صورت اُترا ہے:۔

اے ''عودنگر'' رشکِ ارم، شہرِ مدینہ
فردوس کی خوشبو ہو ترے نام کے صدقے

بلاشبہ ''عودنگر'' کی شاعری نعتیہ مزاج سے ہم آہنگ ہے اور شعری اظہار کا خوبصورت آئینہ بھی۔ جس میں قرآنی مفاہیم کا اُجالا ہے اور احادیث سے استفادہ کی خوشبو بھی، ختمِ نبوّت کا پُرنور تذکرہ ہے اور ناموسِ رسالت کا مشکبو حوالہ بھی۔ آرزوئے حضوری کی کسک ہے اور حسرتِ دیدار کی تڑپ بھی، بارگاہِ رسالت میں مناجات واستغاثہ ہے اور اُمت کے احوال کا درد وکرب بھی، معجزاتِ رسول کی بہار ہے اور احیائے اُمت کی آرزو بھی، شعر کا جمال ہے اور حقیقت نگاری کا کمال بھی۔ بلاشبہ یہ کتاب اہلِ علم وادب اور نعت کے طالب علموں کے لیے ایک گراں قدر تحفہ ہے۔ اللہ کریم صاحب کتاب کو ثنا خوانِ مصطفیٰ کی صف میں باوقار کرے اور اس کی توفیقاتِ مدحت کو اور ثمر بار فرمائے۔ آمین

علی محبت خاں

ڈاکٹر اشفاق احمد وِرک/ لاہور

ڈاکٹر علی محمد خاں تک آتے آتے اس خاندان کا روز گار درس و تدریس سے وابستہ و پیوستہ ہو چکا تھا۔ ان کا خاندان پانی بہت سے حالات میں لت پت ہو کے پاکستان پہنچا تھا۔ وہ چاہتے تو بڑی آسانی سے دیگر دنیاداروں کی کی زمانہ سازی اور جعل سازی سے چڑ اسازی گفتہ سازی فلم سازی اور شکر سازی، جیسے منافع بخش کاروبار سے آنکھیں اور مستقبل خیرہ کر سکتے تھے مگر انھوں نے محنت مزدوری اور نصاب سازی کے ذریعے، آنے والی نسلوں کی کردار سازی پر توجہ مرکوز کیے رکھی۔ ان کے لکھنے پڑھنے کا آغاز تو سکول کے زمانے میں گاچنی والی تختی اور ماسٹروں کی تختی ہی سے ہو گیا تھا۔ چونکہ شروع سے ہی نہایت پریکٹیکل واقع ہوئے ہیں۔ جب دیکھا کہ معاشرتی حالات تلخ اور معاشی تلخ تر ہیں اور ی نسل کی تہذیبی ، سماجی، اقتصادی، افادی و فسادی امور سے آگاہی لازم اور ان کی بے لگام امنگوں کا دف مارنا ضروری ہے، تو بچپن ہی میں فیصلہ کر لیا کہ یہ روایتی شاعروں !یوں کی طرح فرضی محبوب کے لب ورخسار و گیسو کی بلائیں لینے اور شاہانِ وقت کے قصیدے رقم کرنے میں وقت ضائع کرنے کے بجائے نسل نو کو ان کے کیے کرائے کا سبق سکھانے اور جلد از جلد صاحب نصاب ہونے کے لیے دری کتابیں لکھیں گے۔ ملک میں آج بھی اگر بھٹو دور میں بنے والی فلموں یا پیشے اور مزاج کے اعتبار سے صاحب زادہ، پیرزادہ ، نواب زادہ جیسے القاب و خطابات کا رواج ہوتا تو یہ اپنی بے پناہ ترجیحات کے حساب سے نصاب زادہ کا لقب جیتنے میں یقیناً کامران ٹھہرتے۔

لاہور کی ایک بستی سولہ سوا ایکڑ المعروف علامہ اقبال ٹاؤن کی ایک کتاؤنی، ہم بلاک میں ان کی پوری گھر ہستی دو کمروں اور ایک ان تھک کر پر مشتمل ہے۔ سینے کا یہ عالم ہے کہ صبح فجر کی نماز کے بعد قلموں پینسلوں سے لیس ہو کر افرنگی صوفے پر اینٹی قبلہ رخ ہو کے کام کی نیت باندھتے ہیں اور مشتاق احمد یوسفی کے اور کے زرگزشت میں مذکور کردار اینڈرسن کی طرح کہیں آدھی رات کے قریب سلام پھیرتے ہیں بلکہ سلام کیا پھیرتے ہیں، جب گھر والے اندازہ لگاتے ہیں کہ ان کی گفتگو میں بیداری کی نسبت شماری کا غلبہ ہے تو وہاں کو بازو سے پکڑ کر آزو باز و والے سی بیڈ روم میں چھوڑ آتے ہیں لیکن حیرت ناک امر یہ کہ صبح جس بیڈروم میں ہیں حیرتناک امری ہے جب گھر والوں کی آنکھ کھلتی ہے تو یہ دیکھ کے ان کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ جاتی ہیں کہ آں حضرت اسی رات والے پوز میں بستر مرد کی بجائے صوفہ سرد سے برآمد ہوتے سردست برآمد ہیں۔ ہم دوستوں میں سے کوئی بھی بھول کے یا ان کے بہلاوے پھلاوے میں آئے، ان کے ساتھ کسی نصابی کتاب کی تدوین و تسوید کی ذمہ داری قبول کر بیٹھے تو ان کے موبائل سے دن میں پانچ وقت پروف پڑھنے کی اذان سنائی دینے لگتی ہے۔

بچپن میں دیگر بچوں کی طرح ہم لوگ بھی ان دیکھے مستقبل کی اچھی امید میں لہک لہک کے گایا کرتے تھے:

میں چھوٹا سا اک لڑکا ہوں پر کام کروں گا بڑے بڑے

لیکن ان حضرت کو دیکھ کے تو وہی معصوم نعرہ اس انداز میں لگانے کو جی چاہتا ہے:

میں اسی سال لڑکا ہوں ہر کام کروں گا کھڑے کھڑے

ڈاکٹر صاحب کی شادی خانہ آبادی خاندان مغلیہ کی ایک دوشیزہ کے ساتھ نہایت شغلیہ انداز میں آغاز پائی۔ پٹھانوں اور مغلوں جیسے دو گھرانوں کی رئیسانہ فراخ دلی ہی کا ثبوت ہے کہ ان کے مطبخ کے دروازے ہر کہ و مہ کے لیے پھٹی پھٹی آنکھوں اور اُردو محاورے منہ کھلے کا کھلا رہ گیا کی مانند چوبیس گھنٹے وا رہتے ہیں، جہاں آج شوار ما، پیزا، برگر جیسے فیشنی خرخشوں کے دور میں بھی مہمانوں کی تواضع اپنی خاندانی طباخ، رشیدہ جہاں کے خستہ من پراٹھوں اور سر بستہ نگن کبابوں سے کی جاتی ہے۔

خاں صاحب کے بارے میں شنید ہے کہ یہ جوانی کی دہلیز پر قدم رکھتے ہی رفیق الطلی کا شکار تھے، شادی کے فوراً بعد بیوی سے شدید محبت کی بنا پر یہی جذبہ رفیق القلمی میں تبدیل ہو گیا۔ ویسے تو یہ بات پوری دنیا میں مسلم اور مشہور ہے کہ مرد بھی بوڑھا نہیں ہوتا لیکن اس کے ساتھ ساتھ کچھ لوگ وہ بھی کہتے پائے گئے ہیں کہ اگر کسی شخص کو اپنی بیوی کے سراپے یا سگھڑاپے کی بنا پر اس سے سچا پیار ہو جائے تو سمجھیں اس کے بڑھاپے کا آغاز ہو چکا بلکہ یوسفی ہی تو یہاں تک کہتے ہیں کہ:

اپنی بیوی سے محبت کرنا ایسا ہی ہے، جیسے اُس جگہ خارش کی جائے جہاں خارش ہو ہی نہیں رہی۔

لیکن دوستو ہمیں اپنے طویل مشاہدے کی بنا پر یہ بات برملا کہوں گا کہ اپنے خاں صاحب کی بیوی سے محبت کسی اور ہی کینڈے سے تعلق رکھتی تھی، مجھے اس بات کا خوب تجربہ ہے کہ جس دن ہم تمام دوست اپنی بیویوں سمیت ان کے گھر سے ہو آئیں ہمارا اپنے گھر میں رہنا دشوار ہو جاتا ہے۔ اچھی بھلی تابع فرمان بیویاں چھپیاں دے دے کے کہنے لگتی ہیں : کچھ سیکھیں خاں صاحب سے یہ حضرت بیوی کی یاد میں

ایسے تڑپا کرتے کہ مجنوں کو بکن زندہ ہوتے تو ان کے لیے عیسلے، کیلے اور گورے کا پانی بھر بھر کے لاتے۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ ان کی بیوی علاج کی غرض سے بیٹی کے پاس آسٹریلیا میں کی گئیں، یہ اپنی نوکری کی وجہ سے بادل نخواستہ واپس آئے۔ ہمارے جیسا ہوتا تو پنچھی سیدھی چھلانگیں مارتا ہوا آتا، دوستوں کی پارٹیاں کرتا، ہر سینما کا آخری شو دیکھتا لیکن جناب یہ حضرت تو ہمہ وقت گھر میں ایسے تھو جھانے ہو کے بیٹھے رہتے کہ اقبال کا شجر کی ہنی پہ بیٹا اس بلبل کی بار بیعت کرنے کو آیا۔ ایک دن ہم نے بھابی کی آمد کا حساب کر کے ان کی ڈھارس بندھانے کو کہہ دیا" :ذرا حوصلہ رکھیں خال صاحب !اب اُن کے آنے میں فقط سولہ ہی دن تو رہ گئے ہیں۔

بھڑک کر بولے :ساڑھے پندرہ دن کہوٹر کے !آسٹریلیا اور پاکستان کے ٹائم کا فرق پتہ نہیں ہوتا اور جو منہ میں آیا بول دیتے ہیں۔

میں نے ان کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے کہہ دیا :بیچ فرمایا، ساڑھے پندرہ دن ہی بنتے ہیں۔

پھر تھوڑی دیر بعد کچھ یاد کرتے ہوئے اشتیاق آمیز انداز میں گویا ہوئے:

میں نے یہ حساب تو کیا ہی نہیں کہ وہ تھائی ایئر ویز سے آ رہی ہیں اور تھائی پروازیں مقررہ وقت سے آدھ گھنٹہ پہلے لاہور پہنچتی ہیں۔

ڈاکٹر صاحب کے بارے میں اور کیا بتاؤں کہ یہ پرلے درجے کے سیلف میڈ، سیلف سینٹرڈ اور سیلف شارٹ آدمی ہیں۔ درس و تدریس کا نصف صدی سے زائد تجربہ ہے لیکن آج تک تھکاوٹ، اُکتاہٹ اور ہچکچاہٹ نے ان کے گھر کا رستہ نہیں دیکھا۔ ان کی زندگی کی پتنگ اب پچاسی کے ہندسے کو چھونے والی ہے لیکن آج تک چہرے پر نو جوانوں کی رعنائی، جسم میں جوانوں کی سی توانائی اور مزاج میں بچوں کی سی خوش ادائی ہے۔ کم کی کی میٹرک کا امتحان دینے کے بعد گاؤں کے ڈاک خانے کے باہر ستیاں جی کے نام کرائے کی چٹھیاں لکھنے سے عملی زندگی کا آغاز کیا۔ اس چٹھی نویسی سے انھوں نے اپنی عملی زندگی میں کتنا فائدہ اٹھایا، یہ اعداد و شمار ابھی تک پردہ اخفا میں ہیں۔ میٹرک کے بعد سکول میں پی ٹی ماسٹر ہو گئے۔ اس تجربے کا فائدہ یہ ہوا کہ آج اگر پی ٹی آئی میں شامل ہونا چاہیں تو انھیں صرف آئی کی ضرورت پڑے گی۔ بقیہ علیمی مدارج سرکار اور بڑی سرکر کی نوکری کے ساتھ ساتھ طے ہوئے۔ سکول اور جوانی کے زمانے میں جی بھر کے شکار کھیلا لیکن صرف پرندوں کا، حالانکہ جوانی ایسی ٹوٹ کے آئی تھی کہ کئی غزال خود کو چہ قیس کا پتہ پوچھتے پھرتے تھے۔ ڈاکٹر صاحب نے پڑھنے میں جس ترتیب سے سکول، کالج، یونیورسٹی کے مدارج طے کیے تھے، پڑھانے میں بھی اسی درجہ بندی کو عین مین فالو کیا۔ رفتہ رفتہ اللہ تعالی نے ایسا عروج بخشا کہ سال ہا سال گورنمنٹ کے ایک بڑے کالج میں صدر شعبہ رہے، پھر ایک بین الاقوامی یونیورسٹی میں اردو کے مدارالمہام بنے شخصیت میں توازن اور اعتماد ایسا ہے کہ نہ کبھی زندگی میں مزدوری کرنے پر شرمندگی ہوئی نہ عروج کا منہ دیکھنے پر اتراتے نظر آئے۔

ہر آئے گئے کو بتایا کرتے کہ ان کی شادی کو پچاس برس بیت گئے اور اس سے زیادہ کتابیں ان کے کریڈٹ پر ہیں۔ حکیم جی فرماتے ہیں :اس لیے یٹ بھی صرف ایک پیدا کر پائے کیونکہ ہر اتو گری کی یہ کتاب کا چھلہ چل رہا ہوا تھا۔ یہ سیاحت کا نون کی حد تک شوق ہے۔ اس شوق میں دنیا گھوم لی۔ مشتاق احمد یوسفی بھلے کہتے رہے کہ:

بیوی کو یورپ ڈھو کے لے جاتا ایسے ہی ہے جیسے کوئی شمالی علاقہ جات کی سیر کو جائے اور برف کی ڈلی گھر سے تھرماس میں رکھ کے لے جائے لیکن مجال ہے یہ کہیں پنا بیگم کے سدھارے ہوں۔ بیگم کے حضور فرماں برداری کا تو یہ علم تھا کہ ہر بنے کی پہلی کو پوری کی پوری تنخواہ اور موقع بہ موقع بورڈ، یونیورٹی سروس کمیشن سے موصول ہونے والے جملہ چیک لا کے اتنی سرعت سے بیوی کی ہتھیلی پر رکھتے ہیں کہ ہتھیلی پر سرسوں جمانے والا محاورہ بھی منہ دیکھتا رہ جاتا ہے۔ حکیم جی فرماتے ہیں کہ اتنا تو ٹی وی پر ریموٹ کا کنٹرول نہیں ہوتا جتنا بیوی ک ان پر تھا۔ خوش لباس ایسے کہ بیگم جو بھی خرید کے پہنا دیتیں، خوش ہو جاتے۔ بیگم بھی جانتی تھیں کہ اس قدر رعنا پہ جس ملبوس کا بھی نزول ہوگا، پیرہن یوسف کا درجہ اختیار کر لے گا۔

ان کی زن مریدی اور بیگم پرستی کا تذکرہ بہت ہو گیا لیکن اب ذرا جی کڑا اور دل بڑا کر کے ان کی بیوی کی کتھا بھی سن لیں۔ شہرہ آفاق مصور جناب عبد الرحمٰن چغتائی کی عزیزہ تھیں، جو لڑکپن ہی میں ان کو عزیز ہو چکی تھیں۔ خان صاحب کے دل، دماغ اور قلبوت کے انچ انچ پر انھی کا قبضہ تھا۔ خاں صاحب کے کھانے پینے سونے جاگنے، اٹھنے بیٹھنے حتیٰ کہ سوچنے سمجھنے میں بھی ان کی مرضی شامل ہوتی۔ گھر میں ہر وقت مہمانوں کا تانتا بندھا رہتا لیکن جو بھی آتا، انگلیاں چاہتا اور حیرتیں بانٹا ہوا جاتا۔ چند سال قبل میرے ایک عزیز کسی کام کے سلسلے میں میرے ساتھ شیخو پورہ سے لاہور آئے۔ ان کو ایک ڈیڑھ گھنٹہ ان کے گھر میں گزارنے کا موقع ملا۔ باہر نکلتے ہی مجھ سے پوچھنے لگے:

یار دنیا میں ایسی بیویاں بھی ہوتی ہیں؟

عرض کیا :روئے ارض پر ایک ہی دانہ بچا تھا جو

بھلے وقتوں میں خان صاحب لے اُڑے۔ اب تو ہم نے اپنے جہاں گرد دوست ڈاکٹر غفور شاہ قاسم کو یہ ذمہ داری تفویض کر رکھی ہے کہ حضرت آپ گھاٹ گھاٹ کا پانی پیے ہوئے ہیں (سوائے کالا پانی اور دھوبی گھاٹ کے) آئندہ گھات میں رہے گا، ملک کے جس کونے سے بھی اس طرح کی بیویوں کی سُن دھڑک ہمارے لیے دو تین کی بکنگ کروا لیجیے گا۔

مولانا حالی کے ہم وطن ہیں، اس لیے محنت لگن، برداشت بھلمنساہٹ، ادبی ترجیحات، ان کی گھٹی میں پڑے ہیں۔ امانت، دیانت، شرافت، صداقت، پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ کے مونوگرام کی مانند ان کے کردار میں شامل ہیں۔ حق گوئی و بے باکی ان کا خاندانی وتیرہ ہے۔ چلتے چلتے بتاتا چلوں کہ میرا ڈاکٹر صاحب سے پہلا تعارف انٹرمیڈیٹ کی اُردو کی کتاب میں شامل مضمون ماحولیاتی آلودگی کے سبب سے ہوا تھا۔ میں ایک بہت بڑی نعمت سے محروم رہ جاتا اگر مجھے اٹھارہ برس ایف سی میں ان کے ہم درس ہونے کا شرف حاصل نہ ہوا ہوتا۔ ان سے چند ہی ملاقاتوں کے بعد وہ تاثر ماحولیاتی آسودگی میں تبدیل ہو چکا تھا۔ ڈاکٹر صاحب کے سر کے بال اب ماضی بعید کا قصہ ہیں لیکن شخصیت کا دبدبہ اور سج دھج آج بھی ایسی کہ کہیں حاضر بھی ہوں تو لگتا ہے تشریف لائے ہوئے ہیں۔ رنگ ان کا اتنا ہی سفید ہے، جتنا اُردو کے معروف شاعر شہزاد احمد اور مقبول مصنف اے حمید کا تھا اور جن کی بابت شگفتہ خاکہ نگار ضیا ساجد نے لکھا تھا:

ان کی رنگت اُبلے ہوئے چاولوں جیسی ہے، کئی بار جی چاہتا ہے کہ ان کے اوپر دال ڈال کے کھا جاؤں۔

گھر کی ہر چیز تبدیل کرنے یا اسے اپ ڈیٹ رکھنے کے حوالے سے ہم دوستوں میں کوئی ان کا ثانی نہیں۔ وہ گاڑی کی ٹونگ ہو، فرنیچر کا رنگ و روغن ہو، باتھ روم کی ٹوٹی ہو، فرش کی ٹائل ہو، پرانا موبائل ہو قمیض کا کالر ہو، لکھنے کی جھال ہو، ایک لمحے کی تاخیر نہیں کرتے۔ گاڑی کا ٹائر پنکچر ہو جائے، پورا ٹائر تبدیل کر لیتے ہیں۔ کتاب میں شعر کا مزہ نہ آئے، شاعر تبدیل کر لیتے ہیں۔ ٹی وی پر کوئی خبر یا ڈرامے کا کوئی مکالمہ پسند نہ آئے، فوراً چینل بدل لیتے ہیں۔ مرضی کا رزلٹ نہ آئے، ایل ای ڈی تبدیل کر لیتے ہیں، لان میں پھول دکھائی نہ دیں، مالی بدل لیتے ہیں ۔17ھ میں گائے بھینس کی شبیر نہ ابھرے، گوالا بدل لیتے ہیں۔ گھڑی کے اوقات یا ملازم کی اوقات پر شک گزرے، بدلنے میں ذرا دیر نہیں کرتے۔ جوتا اور دوست کاٹ کھانے کو دوڑے، دونوں بدل لیتے ہیں کیسی ناپسندیدہ فرد کی مس کال آ جائے، فون بدل لیتے ہیں۔ حتیٰ کہ بیوی کی کوئی بات بری لگتی تو فوراً بات بدل لیتے۔ ہم نے ڈاکٹر علی محمد خاں کی انھی اداؤں کو دیکھتے ہوئے احباب کو مشورہ دیا تھا کہ:

آج ان کا نام بدل کر علی محبت خان رکھ دیں

بالعموم ادب کی مختصر تعریف یوں کی جاتی ہے کہ یہ زندگی کا ترجمان ہوتا ہے لیکن اگر کسی ادب پارے کا انگھوا براہ راست انسانی زندگی سے پھوٹا ہو تو سونے پر سہاگے والی بات ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا بھر کے ادب میں سوانح نگاری اور بالخصوص آپ بیتی کو ہمیشہ سر آنکھوں پر بٹھایا جاتا ہے کہ اس میں داستان، ناول، افسانے کی طرح فرضی کرداروں کی خیالی دنیا نہیں بسائی جاتی بلکہ حقیقی زندگی کے جیتے جاگتے کرداروں کے تلخ و شیریں تجربات کی بازگشت سنائی بلکہ دکھائی دیتی ہے۔ زندگی کے مختلف شعبوں کا تجربہ رکھنے والے لوگوں کے تجربات اصل میں ہمارے ادبی، معاشرتی، معاشی، سیاسی، دفتری، حالات کی متوازی تاریخ بھی ہوتی ہے۔ کوئی قلم کار کئی دہائیوں اور متفرق رویوں کا عطر نکالتا ہے تو ایک آپ بیتی وجود میں آتی ہے۔ دیدہ ور لوگوں کی انھی کاوشوں کی بنا پر آج ہمارا ماضی رنگا رنگ لوگوں کی جگ بیتیوں اور ہڈ بیتیوں سے بھرا پڑا ہے۔ اس صنف میں قاری کی دلچسپی کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہوتی ہے کہ وہ مختلف آپ بیتیوں کے مطالعے سے نہ صرف ایک ہی وقت میں کئی زندگیاں گزار لیتا ہے بلکہ دوسروں کے تجربات کی روشنی میں اپنی زندگی کے نشیب و فراز سے بہ حسن و خوبی نمٹنے کا ہنر بھی جان جاتا ہے۔ انوکھے تجربات قلبی و سلبی وارداتیں نیز دلچسپ انداز بیان قاری کو سرشار کیے رکھتے ہیں۔ حال ہی میں منظر عام پر آنے والی ڈاکٹر علی محمد خان کی داستان حیرت اس سلسلے میں ایک خوبصورت اضافہ ہے۔ ڈاکٹر صاحب کا تعلق مولانا حالی کے پانی پت سے ہے اور اُردو میں شخصیت نگاری کا ہنر اسی دیس سے پھوٹا تھا۔ ڈاکٹر صاحب جہاں ایک طویل تجربہ رکھنے والے ماہر تعلیم، نصاب ساز اور مصنف و مؤلف ہیں وہیں وہ ایک متحرک سیاح بھی ہیں، پانی پت کی ہجرت کے علاوہ وہ مختلف ممالک کے متعدد اسفار کے ذریعے مختلف تہذیبوں کے باعمل مشاہد بھی ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ پچاسی سالہ زندگی میں لاکھوں لوگ ڈاکٹر صاحب کی نظروں سے گزرے، سیکڑوں رویوں کا سامنا کرنا پڑا، درجنوں رواجوں کا ذائقہ چکھا، کئی مزاجوں کو برداشت کیا، کئی طرح کے تعلقات کے رنگ ڈھنگ دیکھے، تب جا کے ایسی متوازن، ایسی بھرپور اور حیران کن آپ بیتی وجود میں آئی، بقول عزم بہزاد:

ہمارے لہجے میں یہ توازن بڑی صعوبت کے بعد آیا کئی مزاجوں کے دشت دیکھے، کئی رویوں کی خاک چھانی

CamScanner

ملنے کے نہیں نایاب ہیں ہم

ڈاکٹر سعدیہ حسن بلوچ/لاہور

میں نے ورک صاحب کا ڈاکٹر علی محمد خاں کی بابت خاکہ بعنوان ''باقائدِ اعظم'' نہیں پڑھا مگر لگتا یوں ہی ہے کہ محمد علی جناح کے نام کو مغلوب کر کے علی محمد خاں کے نام سے رب کریم نے انہیں انجمن علم و ادب کا وارث بنا کر دبستان اساتذہ لاہور میں مبعوث فرمایا ہے۔

ان کی آپ بیتی ''داستانِ حیرت'' پڑھنا شروع کی تو حیرت در حیرت میں مبتلا ایک سانس میں پڑھتی چلی گئی۔ مجھے یوں محسوس ہوا گویا ایک بزرگ اُستاد، دانش ور عالم اور کسی نستعلیق شخصیت کا خوش خط و خوش بیاں قلم، زماں در زماں اوراقِ زندگی کو پلٹتے ہوئے کبھی حیران کرتا ہے، کبھی ہنساتا ہے، کبھی دم بخود کر دیتا ہے، کبھی ان دیکھی سرزمینوں کو سیر کراتا ہے اور کبھی علم کا بحرِ بے کراں بن کر صدف و گہر جبین کی دعوت دیتا ہے۔

صاحبو! تقدیر بھی انسان کو کیا کیا رنگ دکھاتی ہے۔ جتنا پامال کرتی ہے، اتنا ہی ہموار بھی کر دیتی ہے، سونے کو کندن بنا ڈالتی ہے، جسے علم عطا کرتی ہے، اسے عاجزی کا پیکر بھی بنا دیتی ہے۔ راضی بہ رضا بھی تقدیر ہی کرتی ہے مگر صاحبو! کیا سب کچھ محض تقدیر ہی کی کارفرمائی ہے؟ نہیں ہرگز نہیں۔ ڈاکٹر علی محمد خان کی خود نوشت ''داستانِ حیرت'' تقدیر کی بوقلمونیوں کے ساتھ ساتھ تدبیر کی کرشمہ سازیوں سے بھی قاری کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیتی ہے۔

ارضِ پانی پت سے مولانا حالؔی کی مانند ڈاکٹر علی محمد خاں کو علم اور عاجزی کی وراثت کے علاوہ مشقت و محنت اور جفاکشی کا قیمتی ورثہ بھی ملا، جسے انہوں نے آگے بڑھ کر تھاما، چوما اور سینے سے لگایا اور جسے آج تک وہ اپنا رہبر و رہنما مانتے ہیں۔

''داستانِ حیرت'' پڑھتے ہوئے الطاف حسین حالؔی کے وہ معروف اشعار بار بار ذہن میں آتے رہے اور دل ان کی تصدیق کرتا رہا۔

مشقت کی ذلت جنہوں نے اُٹھائی
جہاں میں ملی ان کو آخر بڑائی
کسی نے بغیر اس کے ہرگز نہ پائی
فضیلت، نہ عزت، نہ فرماں روائی
نہال اس گلستاں میں جتنے بڑھے ہیں
ہمیشہ وہ نیچے سے اُوپر چڑھے ہیں

''داستانِ حیرت'' بلا مبالغہ سیکڑوں شخصیات کا مرقع اور قریباً ڈیڑھ سو برس کی تاریخ سمیٹے ہوئے ہے۔ یہ تاریخ محض شنیدہ نہیں بلکہ دیدہ ہے اور اس شنیدہ و دیدہ تاریخ کو ڈاکٹر صاحب نے مرقومہ میں تبدیل کر دیا ہے۔ میرے تئیں یہ ڈاکٹر صاحب کا اپنی قوم کے لیے ایک بڑا تحفہ ہے۔ انہوں نے کتنے ہی انمول بھولے بسرے لوگوں کو زندہ کر دیا ہے۔ بقول پروفیسر جعفر بلوچ:

ہیں سمندر کی تہوں میں ایسے کتنے ہی گہر
جن کی منظر تابیوں کو جانتا کوئی نہیں
ایسی کتنی ہی بہاریں آئی ہیں صحراؤں میں
جن کے حسن رنگ و بو سے آشنا کوئی نہیں

ڈاکٹر صاحب کا حافظہ کمال اور یادداشت شاندار ہے اور یہ ان کی موروثی صنعت بھی ہے۔ ان کے باپو، انہیں اپنے پرانے زمانے کے چشم دید واقعات، جزئیات سمیت سنایا کرتے تھے جس کا اعتراف ڈاکٹر صاحب نے جا بجا کیا ہے۔ کہتے ہیں:

''مجھے باپو سے پرانے زمانے کے چشم دید واقعات ماں جی سے چڑیا چڑے کی نوعیت کی کہانیاں سننے میں بڑا مزہ آتا تھا۔ نہ تو کبھی انہوں نے سنانے میں بخل سے کام لیا اور نہ کبھی میں نے حیل و حجت سے کام لیا۔ بس انہیں ہمیشہ سنانے اور مجھے ہمیشہ سننے سے غرض رہی۔''

ڈاکٹر علی محمد خان کی خوبی یہ ہے کہ وہ سادہ، رواں اسلوب میں اپنی زندگی کی داستان کو بغیر مبالغے کا تڑکا لگائے، دوسروں کو متاثر کرنے کی خواہش سے بے نیاز، بیان کرتے جاتے ہیں۔ ایک اچھی سوانح کی یہی خوبی ہوتی ہے کہ سوانح نگار کچھ اخفا میں نہ رکھے۔ ڈاکٹر صاحب کہیں اپنے ممدوحین کی بے جا مداحی نہیں کرتے۔ یہاں تک کہ اپنے والد کی سادہ لوحی کا بھی برملا اعتراف کرتے ہیں۔ مثلاً میٹرک کے امتحان میں جب انہیں 45 روپے کا اعزازی ماہانہ وظیفہ ملنے کا علم ہوا، بہت خوش ہوئے، مگر جب یہ ماہانہ وظیفہ کالج میں داخلے سے مشروط ہونے کا سنا تو کہنے لگے (چونکہ وہ ڈاکٹر صاحب کو مزید بڑھانا نہ چاہتے تھے)

اُس طرح تو وہ پڑھائی کر کے کمزور ہو جائے گا۔

یا کہتے ہیں:

''(باپو) خالص ہریانوی بولتے مگر گفت گو کے درمیان بے پرری گالیوں کا تڑکا ضرور لگاتے تھے۔''

''ماں جی اور باپو کی یہ فطرتِ ثانیہ تھی کہ وہ دونوں وجہ، بے وجہ بہت جھگڑا کرتے تھے۔''

ڈاکٹر صاحب کو مرقع نگاری خوب آتی ہے۔ مختلف شخصیات کی ظاہری مشکل صورت، لباس، چہرے مہرے کی قلمی تصویر کشی کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

''باپو کا قد درمیان، رنگ گورا اور چہرے پر سفید ریش انہیں بڑی پھبتی تھی اس طرح دیکھنے میں وہ

حد درجہ خوب رو اور بارعب لگتے تھے۔"

"فیضی صاحب کی وضع قطع، تراش خراش، نشست و برخاست ملگجی رنگ کی نفیس شیروانی زیب تن جس سے بھینی بھینی خوشبو آ رہی تھی، دل کو بہت بھائی۔"

ڈاکٹر صاحب اوّل و آخر استاد ہیں اور اول و آخر شاگرد بھی۔ وہ ہر دم سیکھنے کو تیار اور سکھانے کو بھی ہر دم تیار رہتے ہیں۔

ان کی آپ بیتی میں ایسی مثالیں درجنوں ہیں مثلاً اپنے جن جن اساتذہ سے انہوں نے سیکھا، ان کے احسان کے معترف ہیں:

"میں سمجھتا ہوں کہ تعلیمی لحاظ سے میری ترقی کی عمارت کا شاخسانہ یہی رہا ہے جس کی خشت اوّل میرے اساتذہ کرام نے پرائمری سکول کے زمانے میں رکھی۔"

"بس انہیں یہ خبط تھا کہ ان کے شاگرد لائق فائق ہو جائیں اور کارزارِ حیات میں نام پیدا کریں"۔

اسی طرح جب بھارت تدریس کی خشت اوّل رکھی تو سکھانے کو جوش و خروش کے ساتھ تیار تھے۔ لکھتے ہیں:

"پہلے دن سے میرے ذہن میں یہ بات بیٹھی ہوئی تھی کہ میں نے تعلیم و تدریس کا جو پیشہ اختیار کیا ہے یہ ایک پیغمبری و پاک پیشہ ہے اور اگر مجھے اس کے ذریعے صرف اتنی یافت ہو جائے کہ میری گزر بسر ڈھنگ کی رہے تو یہ غنیمت ہے۔"

وہ پہلے روز سے آج تک روایتی تدریس طریقوں کے برعکس دو ایسے زریں اصول اپنائے ہوئے ہیں، جن کے باعث آج ان کے سیکڑوں شاگرد ملک کے طول و عرض میں اچھے تدریسی، انتظامی عہدوں پر فائز ہیں اور اپنے اُستادِ محترم کے قدردان بھی۔ یہ دو اصول شاگردوں کو خوش خط بنانے اور محبت سے سکھانے کے ہیں جو آئندہ آنے والے اساتذہ کے لیے بھی مشعلِ راہ ہیں۔

داستانِ حیرت میں ڈاکٹر صاحب نے زمانی ترتیب کو خاطر خواہ حد تک مدنظر رکھا ہے۔ بچپن، ابتدائی تعلیم و تربیت، اپنے والدین کی یادیں، اعلیٰ تعلیم کا سفر، سیاسی تبدیلیاں، ملازمتی زندگی، خانگی زندگی، زندگی کے زینہ بہ زینہ سفر پر ملنے والے دوست احباب کی یادیں، اندرون و بیرون ملک اسفار کی تفصیل اور تا حال اپنی معروف زندگی کے تذکرے۔ کوئی پہلو ایسا نظر نہیں آتا، جو سہو قلم سے چھوٹ گیا ہو۔

"داستانِ حیرت" کو اگر ملکِ عزیز اور خاص کر لاہور کے ادبا، شعرا، نثر نگاروں، پرنسپل حضرات، پبلشرز، ماہرین مضامین اور پروفیسرز کی اچھی خاصی ادبی اسلوب میں لکھی گئی ڈائریکٹری کہا جائے تو، کچھ بے جا نہ ہوگا۔ چند ممدوحین کے نام ملاحظہ ہوں:

احمد عقیل روبی، مظہر محمود شیرانی، عمر فیضی، صابر لودھی، شہرت بخاری، افسر رضوی، نبوت یار خان، رانا یوسف، سجاد رضوی، جعفر بلوچ، وحید الحسن ہاشمی، ظفر شارب، حسن عسکری کاظمی، احسان الٰہی سالک، افتخار احمد باجوہ، فقیر محمد کیفی، ڈاکٹر جمیل الرحمٰن، ڈاکٹر نجیب جمال، محمد فیصل، بیسٹر ایچ آر ما کوسٹ عبدالجبار شاکر، محمد احمد، رانا نعمان اعجاز، جواد طاہر، عامر بن علی غرض ادیبوں شاعروں کی ایک کہکشاں ہے، جو "داستانِ حیرت" کے آسمانِ حیرت پر فروزاں ہے۔

پیشتر شخصیات کے خاکے بھی اس آپ بیتی کا حصہ ہیں۔ ان کے عنوانات صاحب خاکہ کے شخصیت کے عین مطابق گویا اسم بامسمّٰی ہیں۔ مثلاً شاعر اہل بیت ...... حسن عسکری، بیت الحکمت کا معمار...... عبدالجبار شاکر، رفیق زندگی...... فاخرہ چغتائی۔ علم و فضل کا بے پایاں دریا...... پروفیسر احسان الٰہی سالک عظیم رفیق کار...... پروفیسر جعفر بلوچ وغیرہ وغیرہ۔

ڈاکٹر صاحب کی "داستانِ حیرت" نے اس وقت مزید حیران کر دیا۔ جب میں نے غور کیا کہ ڈاکٹر صاحب نے مزید حیران کر دیا۔ جب میں نے غور کیا کہ ڈاکٹر صاحب نے اپنی آپ بیتی میں کسی ایک بھی ہستی کی ذرہ بھر برائی نہ کی۔ اس دنیا میں ہمارا واسطہ اچھوں بروں ہر طرح کے لوگوں سے پڑتا ہے، مگر سلام ہے ان کی عالی ظرفی پر مثال کے طور پر انہوں نے چودھری احمد سعید کی مفصل سرنوشت بسیار محنت شاقہ کے بعد لکھی مگر ان کے اہل خانہ کی جانب سے خیر مقدمی یا پذیرائی تو کیا، شکریے کے دو بول بھی سننے کو نہ ملے تو ڈاکٹر صاحب نے اس انتہائی ناقدری پر بھی صرف اتنا کہا: آفرین ہے اس رویے پر

وہ صحیح معنوں میں مومن کے اس شعر کی عملی تفسیر ہیں:

نارسائی سے دم رُکے تو رُکے
میں کسی سے خفا نہیں ہوتا

ایسی وضع داری کی مثالیں اب کہاں ملتی ہیں؟

ان کی خودنوشت زندگی اور اہل دنیا سے محبت کی بے مثل عکاس ہے۔ ہمارے ہاں خاص کر مزاحیہ شاعری میں جب تک بیگم کی برائی عموماً بر تفنن طبع اور کبھی تضحیک آمیز انداز میں نہ کر لی جائے، لگتا ہے شاعری یا شاعر دونوں نامکمل ہیں۔ میں نے اردو کے شعراء کو بہت ہی کم اپنی ازواج کو سراہتے ہوئے دیکھا ہے۔ ایک اپنے والد کے اس شعر کو ہی پڑھ پڑھ کر سر دھنتی رہی جو انہوں نے اپنے مجموعہ غزل "اقلیم" کا انتساب بیگم کے نام کرتے ہوئے لکھا:

مجھ کو اس پر ناز ہے میرا یہ پاکیزہ لباس
باعث توقیر و زیبائش بنا میرے لیے

اور ایک ڈاکٹر صاحب نے اپنی نثر میں جس طرح اپنی بیگم کو سراہ کر، ان کی نیکیوں، ان کی خدمات کو خراج تحسین پیش کیا ہے یقین جانیے میں بہت ہی متاثر ہوئی ہوں اور ان کے تمام قاری بھی ہوں گے۔ آپ بھی سنیے:

''میرے اور ان کے بیک وقت چھے سات رشتے تھے، وہ میری اہلیہ تھیں، میری بیٹی کی ماں تھیں میری دوست اور غم گسار تھیں، میری محبوبہ تھیں میری سیکرٹری تھیں۔ میرے گھر ''کنج عافیت'' کی منتظم و منصرم اعلیٰ تھیں اور سیر و سیاحت میں ہمیشہ میری شریک سفر ہیں۔''

داستانِ حیات کا اسلوب رواں، شگفتہ اور سادگی کی خوب صورت مثال ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

''متر انوالی کا انٹر کالج بڑی پر فضا جگہ پر واقع ہے اور فطرت کے مقاصد کے شیدائی یہاں جی بھر کر سر سبزی و شادابی کو اپنی آنکھوں میں بسا سکتے ہیں۔ جب میں گاؤں میں پہنچتا ہوں تو دل خوشی کے مارے بلیوں اُچھلتا ہے اور میرا جی چاہتا ہے کہ میں گاؤں کی گلیوں میں ایک دفعہ پھر اسی طرح بھاگوں دوڑوں اور کرکٹ کی گیند کرانے کی کوشش کروں جس طرح میں چھٹ پنے میں کیا کرتا تھا لیکن فوراً ہی اس گماں کو یہ خیال کر کے جھٹک دیتا ہوں کہ لوگ کیا کہیں گے کہ یہ شخص کیا کر رہا ہے اس کو اپنے بڑھاپے کا بھی خیال نہیں۔''

اپنی ماں کی ممتا کی مثال کس پیاری تشبیہ سے دیتے ہیں:

''انہوں نے اپنی اولاد کی پرورش کچھ اس طرح کی تھی جس طرح مرغی اپنے نوزائیدہ چوزوں کی کرتی ہے اور جب بھی اسے کوئی آرز دل جاتا ہے تو کٹ کٹ کر کے فوراً اپنے چوزوں کو اپنے پاس بلا لیتی ہے۔ آفرین ہے کٹ کٹ کرتی مرغی کی زندگی پر! عین یہی حال ماں جی کا تھا۔''

ایک اور تشبیہ دیکھیے:

''ضعیف الاعتقادی ایک ایسا گھمسن کھایا ہوا درخت ہے، جس پر ہر چند کبھی پھل نہیں لگتا مگر جس کی جڑیں بڑی گہری اور مضبوط ہیں۔''

ڈاکٹر صاحب اگر چہ شاعر نہیں ہیں مگر شاعری کا عمدہ ذوق رکھتے ہیں اور موقع محل کی مناسبت سے اشعار کا جا بجا استعمال ہے۔ اقبال، ظفر علی خاں اور غالبؔ کے اشعار ان کی نثر میں موتیوں کی طرح جڑے ہوئے ملتے ہیں۔ فارسی کی ضرب الامثال اور اشعار بھی ان کی نثر کی علمیت اور حسن میں اضافہ کرتی دکھائی دیتی ہیں۔ مثلاً دستِ خود، دہانِ خود، شنیدہ کے بود مانند دیدہ، دروغِ مصلحت آمیز بہ ز راستی فتنہ انگیز، این سعادت بزور بازو نیست، کند ہم جنس با ہم جنس پرواز وغیرہ۔

ڈاکٹر علی محمد خان نے خورائے اپنے والد محترم کی بابت دی تھی، نسخے کے طور پر ذرا سے تصرف کے ساتھ، میں ان کے لیے بھی کہنا چاہتی ہوں:

''ڈاکٹر علی محمد خاں کی ایسی ہی سینکڑوں باتیں (خصوصیات) ہیں جنہیں ورطۂ تحریر میں لایا جانا اس لیے ضروری ہے کہ ان کی عادات و اطوار اور اعمال و افکار تمام لوگوں کے لیے...... لازماً ایک ایسی کھلی کتاب کی مانند ہیں جن کے ہر ہر صفحے پر ان کے لیے دین و دنیا میں حیات جاوداں کا سامان موجود ہے۔''

ڈاکٹر صاحب کی آپ بیتی ان میں اس کا ہمہ وقتی تحرک، جوش و جذبہ عمل پسندی، خلوص، محبت، سادگی، تواضع، انکساری، شجاعت، سخاوت کے مناظر جگہ جگہ دامنِ دل کو اپنی جانب کھینچتے ہیں کہ جا اینجاست!

میرے سر پر سوار تھوڑی ہے
ایک دشمن ہے یار تھوڑی ہے

اک تناسب سے مجھ کو ملتا ہے
رزق ہے ماں کا پیار تھوڑی ہے

چھوڑ کر مجھ کو جا بھی سکتا ہے
یار ہے یارِ غار تھوڑی ہے

سر جھکا کر نہیں اُٹھا کر مانگ
یہ ہے مسجد مزار تھوڑی ہے

تم کو ظاہر ہے لوگ دیکھیں گے
خواب پر اختیار تھوڑی ہے

تم سے پہلے جو وقت گزرا تھا
زندگی میں شمار تھوڑی ہے

پھول آئے ہیں تیرے آنے سے
ورنہ موسم بہار تھوڑی ہے

دیکھ جنت ہے ماں کے قدموں میں
آسمانوں کے پار تھوڑی ہے

مسئلہ ہے کوئی بصارت میں
آئینے پر غبار تھوڑی ہے

یار اس دل کو کون دیکھتا ہے
کوئی کوٹھی یا کار تھوڑی ہے

عشق میں اک قرار تھا لیکن
عشق اب برقرار تھوڑی ہے

میرا ہمدرد ایک میں ہی ہوں
کوئی لمبی قطار تھوڑی ہے

ندیم راجہ

ادب برائے فروخت

لبنیٰ صفدر/ لاہور

زمانہ بدلتا ہے تو اس کے پیمانے بھی بدل جاتے ہیں۔ کبھی اقدار کا وزن کردار سے ناپا جاتا تھا اور کبھی لفظ کی قیمت اس کی معنویت سے لگائی جاتی تھی۔ مگر اب بازار کی منڈی میں ہر شے کی قیمت اس کے خریدار سے طے ہوتی ہے۔ یہی اصول جب ادب پر لاگو ہوا تو لفظ نے اپنی معنوی عظمت کے بجائے اپنی فروختگی پر فخر کرنا شروع کر دیا۔ آج کے عہد میں ادب صرف لکھا نہیں جاتا بلکہ ترتیب دیا جاتا ہے، پیک کیا جاتا ہے اور برانڈ بنایا جاتا ہے اور باقاعدہ حکمت عملی کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے۔ تخلیق کا وہ عمل جو کبھی وجدان کی آگ میں پکتا تھا اب مارکیٹنگ کی میز پر منصوبہ بندی کے ساتھ ترتیب پاتا ہے۔

یہ منظر کسی اتفاق کا نتیجہ نہیں بلکہ ایک طویل سماجی ارتقا کی پیداوار ہے۔ جب معاشرے کی اساس صارفیت پر قائم ہو جائے تو فکر بھی صارف بن جاتی ہے۔ لفظ بھی چیز بن جاتا ہے اور جذبہ بھی ایک شے بن جاتا ہے۔ ادب اب محض اظہار نہیں بلکہ ایک صنعت ہے۔ اس صنعت کے اپنے اصول ہیں اپنے اہداف ہیں اور اپنی ترجیحات ہیں۔ اس میں وہی کامیاب ہے جو ذوق کی بجائے طلب کو سمجھے اور احساس کی بجائے رجحان کو پہچانے۔

ادب برائے فروخت کی اصطلاح بظاہر طنز ہے مگر درحقیقت ہمارے عہد کی تشریح ہے۔ کبھی شاعر اپنے دکھ کو اس لیے لکھتا تھا کہ وہ اسے برداشت نہ کر پاتا تھا۔ آج وہ اس لیے لکھتا ہے کہ شاید یہی دکھ زیادہ خریدار کھینچ لے۔ پہلے آنسو سچے ہوتے تھے اور بعد میں قاری روتا تھا۔ اب پہلے قاری کے رونے کا انداز دیکھا جاتا ہے پھر ویسا ہی آنسو تخلیق کیا جاتا ہے۔

ہماری ادبی فضا میں اب ایک نئی قسم کی مہارت پیدا ہو چکی ہے۔ یہ مہارت جذبات کی پیشکش کی ہے۔ جس نے مصنف اور شاعر کو یہ سکھا دیا ہے کہ کہانی کے کس موڑ پر قاری کو کتنا چونکا دینا ہے۔ اور کس مقام پر قاری کو رلا دینا ہے۔ کس جملے میں ایسا فقرہ رکھ دینا ہے جو اقتباس بن سکے اور سوشل میڈیا پر گردش کرے۔ گویا ادب اب تجربہ نہیں بلکہ ترتیب شدہ تاثر ہے۔

یہ سچ ہے کہ ادیب مکمل طور پر کبھی معصوم تو نہیں رہا۔ درباروں کے شاعر قصیدے کہتے تھے۔ حکمرانوں کی تعریف میں دیوان لکھے جاتے تھے۔ مگر اس سب کے باوجود ان ادوار میں بھی کہیں نہ کہیں ایک داخلی صداقت موجود رہتی تھی۔ آج کا مسئلہ یہ نہیں کہ ادب بک رہا ہے بلکہ یہ ہے کہ ادب خود کو بیچنے کے لیے اپنی ساخت بدل رہا ہے۔ وہ اپنے لہجے کو، اپنی خوبصورتی کو قاری کے لیے محض پُرکشش بنا رہا ہے۔ اپنے سوالوں کو محدود کر رہا ہے۔ اپنے احتجاج کو آداب کے سانچے میں میں لپیٹ رہا ہے۔

بازار کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ ہر چیز کو قابل قبول بنا دیتا ہے۔ اگر کوئی موضوع بکتا ہے تو اسے بار بار پیش کیا جاتا ہے یہاں تک کہ وہ عام ہو جائے۔ رومان اگر بکتا ہے تو ہر دوسرا ناول محبت کا قصہ بن جاتا ہے۔ خودی اور کامیابی اگر فروخت کا ذریعہ بنیں تو ہر طرف کامیابی کے نسخے پھیل جاتے ہیں۔ دکھ اگر بکے تو دکھ کو خوبصورت بنا دیا جاتا ہے۔ یوں زندگی کی پیچیدگی سادہ خاکوں میں تبدیل ہو جاتی ہے۔

ادب کا اصل کام زندگی کی پیچیدگی کو نمایاں کرنا تھا نہ کہ اسے سہل بنانا۔ مگر جب مقصد فروخت ہو تو پیچیدگی خطرہ بن جاتی ہے۔ قاری کو زیادہ سوچنے پر مجبور کرنا رسک سمجھا جاتا ہے۔ مشکل جملے کم کر دیے جاتے ہیں۔ گہرے استعارے ہٹا دیے جاتے ہیں۔ فلسفیانہ سوال مختصر کر دیے جاتے ہیں۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ادب کا وہ پہلو جو ذہن کو چیلنج کرتا تھا رفتہ رفتہ پس منظر میں چلا جاتا ہے۔

ہماری تعلیمی ساخت بھی اس صورت حال کی ذمہ دار ہے۔ طلبہ کو نصابی خلاصوں کی عادت ڈال دی گئی ہے۔ وہ پوری کتاب پڑھنے کے بجائے اس کا نچوڑ چاہتے ہیں۔ جب مطالعہ خلاصے تک محدود ہو جائے تو ادب کی تہہ داری کیسے باقی رہے گی۔ اس کے اسرار و رموز کی پرتیں کیسے کھلیں گی ۔۔ ایسے میں وہی تحریر زیادہ مقبول ہوگی جو کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ تاثر دے سکے۔

ادب برائے فروخت کا ایک اور پہلو انعامات اور اعزازات کا نظام ہے۔ جب ایوارڈز کا معیار بھی تعلقات اور تشہیر سے جڑ جائے تو تخلیق کار کے سامنے ایک اور راستہ کھل جاتا ہے۔ وہ لکھنے سے زیادہ دکھنے کی فکر کرنے لگتا ہے۔ تقریبات میں شرکت اہم ہو جاتی ہے۔ تصاویر اہم ہو جاتی ہیں۔ نام کی گونج اہم ہو جاتی ہے۔ اور لفظ پس منظر میں چلا جاتا ہے۔

یہ طنز کا مقام ہے کہ ہم ہر نئی کتاب کو شاہکار قرار دیتے ہیں۔ تنقید اب تعریف کا دوسرا نام بن چکی ہے۔ اختلاف کو دشمنی سمجھا جاتا ہے۔ معروضی رائے دینے والا اکثر تنہا رہ جاتا ہے۔ اس ماحول میں معیار کا سوال اٹھانا بھی خطرناک سمجھا جاتا ہے۔ یوں ادب کا داخلی احتساب کمزور پڑ جاتا ہے۔

بازار کی منطق سادہ ہے۔ جو بکے وہ اچھا ہے۔

مگر ادب کی منطق اس سے مختلف تھی۔ جو سچا ہو وہ اچھا ہے۔ جب یہ دونوں منطقیں ٹکراتی ہیں تو تخلیق کار ایک کشمکش میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ سچ لکھنے سے ممکن ہے کتاب کم بکے۔ مگر نہ لکھنے سے اس کی روح بے چین رہے گی۔ یہی کشمکش اس عہد کے ادیب کی اصل آزمائش ہے۔

ہمیں یہ بھی تسلیم کرنا ہوگا کہ معاشی دباؤ ایک حقیقی مسئلہ ہے۔ ادیب بھی انسان ہے۔ اسے بھی گھر چلانا ہے۔ اسے بھی ذمہ داریاں نبھانی ہیں۔ ایسے میں اگر وہ اپنی تحریر سے آمدنی چاہتا ہے تو اس میں قباحت نہیں۔ مسئلہ صرف اس وقت پیدا ہوتا ہے جب آمدنی ہی معیار بن جائے اور صداقت ثانوی حیثیت اختیار کر لے۔

ادب برائے فروخت کا سب سے گہرا اثر قاری کی تربیت پر پڑتا ہے۔ جب مسلسل ہلکا ادب پڑھایا جائے تو ذہن اسی سطح کا عادی ہو جاتا ہے۔ گہرے مباحث سے تھکن ہونے لگتی ہے۔ طویل ناول بوجھ محسوس ہوتے ہیں۔ فلسفیانہ مکالمے اکتاہٹ کا باعث بنتے ہیں۔ یوں فکری برداشت کم ہوتی جاتی ہے۔ معاشرہ فوری ردعمل کا عادی ہو جاتا ہے۔ غور و فکر کی روایت کمزور پڑ جاتی ہے۔

اس صورت حال میں امید کی کرن کہاں ہے۔ امید ان قلمکاروں کی وجہ سے قائم ہے جو خاموشی سے اپنا کام کر رہے ہیں۔ وہ شاید زیادہ فروخت نہ ہوں مگر وہ معیار پر سمجھوتہ نہیں کرتے۔ وہ موضوع کا انتخاب رجحان دیکھ کر نہیں بلکہ ضرورت دیکھ کر کرتے ہیں۔ وہ لفظ کو اس کی اصل معنویت کے ساتھ برتتے ہیں۔ تاریخ نے ہمیشہ ایسے ہی لوگوں کو یاد رکھا ہے۔ وقتی شہرت کی چمک جلد ماند پڑ جاتی ہے مگر سچا ادب دیرپا ہوتا ہے۔

ادب کو مکمل طور پر بازار سے الگ کرنا ممکن نہیں۔ نہ ہی یہ ضروری ہے۔ مسئلہ بازار کی موجودگی نہیں بلکہ اس کی بالادستی ہے۔ اگر بازار فیصلہ کرے کہ کیا لکھا جائے اور کیسے لکھا جائے تو ادب محض صنعت بن جائے گا۔ اگر ادب اپنی داخلی خودمختاری برقرار رکھے اور بازار کو محض ذریعہ سمجھے تو توازن قائم رہ سکتا ہے۔

ہمیں قاری کی ذمہ داری بھی یاد رکھنی چاہیے۔ اگر قاری صرف آسانی چاہے گا تو اسے آسانی ہی ملے گی۔ اگر وہ گہرائی کا مطالبہ کرے گا تو تخلیق کار بھی اس کی طرف مائل ہوگا۔ ادب کا معیار یک طرفہ عمل نہیں بلکہ مشترکہ ذمہ داری ہے۔

ادب برائے فروخت کے اس عہد میں سب سے اہم سوال یہی ہے کہ کیا لفظ کو مکمل طور پر خریدا جا سکتا ہے۔ شاید نہیں۔ کیونکہ لفظ کے اندر ایک ایسی آگ ہوتی ہے جو کسی نہ کسی مرحلے پر سچ کو ظاہر کر دیتی ہے۔ وقتی طور پر اسے نرم کیا جا سکتا ہے مگر ہمیشہ کے لیے نہیں۔

اگر ہم نے ادب کو محض تجارت بنا دیا تو آنے والی نسلیں محض چمکدار سرورق ورثے میں پائیں گی اور اندر سے خالی صفحات۔ مگر اگر ہم نے تجارت میں بھی صداقت کا عنصر شامل رکھا تو ممکن ہے کہ بازار بھی ادب کا دشمن نہ رہے بلکہ اس کا وسیلہ بن جائے۔

اصل مسئلہ فروخت نہیں بلکہ فروختگی ہے۔ فروخت محنت کا معاوضہ ہو سکتی ہے مگر فروختگی ضمیر کا سودا ہے۔ ادب اگر معاوضہ لے تو یہ اس کا حق ہے۔ مگر اگر وہ اپنی روح بیچ دے تو یہ اس کی شکست ہے۔

ہمیں فیصلہ کرنا ہے کہ ہم کس طرح کا ادب چاہتے ہیں۔ وہ جو لمحاتی مسرت دے اور جلد بھلا دیا جائے۔ یا وہ جو ذہن میں سوال جگائے اور برسوں ساتھ چلے۔ انتخاب ہمارے ہاتھ میں ہے۔

ادب روشنی بھی بن سکتا ہے اور اشتہار بھی۔ روشنی کم مگر دیرپا ہوتی ہے۔ اشتہار زیادہ مگر عارضی۔ اگر ہم نے روشنی کا راستہ اختیار کیا تو ممکن ہے کہ فروخت کم ہو مگر وقار زیادہ ہوگا۔ اور اگر ہم نے اشتہار کو ترجیح دی تو شور تو بہت ہوگا مگر معنویت کم ہو جائے گی۔

ادب برائے فروخت کا یہ عہد ہمیں آئینہ دکھا رہا ہے۔ یہ بتا رہا ہے کہ ہم کیا پڑھنا چاہتے ہیں اور کیوں پڑھنا چاہتے ہیں۔ اگر ہم نے اس آئینے میں اپنی کمزوری پہچان لی تو شاید ہم ادب کو دوبارہ اس کی اصل سمت دے سکیں۔ ورنہ بازار کے ہجوم میں لفظ کی آواز دبتی چلی جائے گی۔

ادب کوئی معمولی شے نہیں۔ یہ تہذیب کا حافظہ ہے۔ یہ قوم کی روح کی زبان ہے۔ اسے صرف منافع کی ترازو میں تولنا اس کی توہین ہے۔ اگر ہم چاہتے ہیں کہ آنے والی نسلیں بھی سوچ سکیں اور سوال اٹھا سکیں اور احساس کی گہرائی کو سمجھ سکیں تو ہمیں ادب کو محض فروخت کا سامان بنانے سے گریز کرنا ہوگا۔

اور شاید یہی اس طنز کا اصل مقصد ہے کہ ہم مسکرا کر اپنی کمزوری کو پہچان لیں اور سنجیدگی سے اس کا علاج تلاش کریں۔ ادب اگر زندہ رہا تو معاشرہ بھی زندہ رہے گا۔ اور اگر ادب صرف فروخت کی چیز بن کر رہ گیا تو ہم شاید بظاہر خوشحال ہوں گے مگر اندر سے خالی ہو جائیں گے۔

لفظ کا تقدس برقرار رکھنا ہم سب کی ذمہ داری ہے۔ کیونکہ جب لفظ بکتا ہے تو صرف کتاب نہیں بکتی بلکہ فکر کا معیار بھی نیلام ہوتا ہے۔ اور جب فکر نیلام ہو جائے تو معاشرے کی روح کمزور ہو جاتی ہے۔ اس لیے ادب کو بازار میں لے جایا جا سکتا ہے مگر اسے بازار کا غلام نہیں بنایا جا سکتا۔ یہی توازن ہماری فکری بقا کی ضمانت ہے۔

CamScanner

جبار واصف/رحیم یار خاں

حال ہی میں ان کے شائع ہونے والے شعری مجموعہ ''گزران'' سے منتخب غزلیں۔

گھنگھرو پہ بات کر، نہ تو پائل پہ بات کر
مجھ سے طوائفوں کے مسائل پہ بات کر
فٹ پاتھ پر پڑا ہوا دیوانِ میر دیکھ
رڈی میں بکنے والے رسائل پہ بات کر
گورے مصنّفین کی کالی کتب کو پڑھ
کالے مصنفوں کے خصائل پہ بات کر
منبر پہ بیٹھ کر سنا جھوٹی حکایتیں
خطبے میں سچ کے فضل و فضائل پہ بات کر
اس میں بھی اجر ہے نہاں نفلی نماز کا
مسجد میں بھیک مانگتے سائل پہ بات کر
میرا دُعا سے بڑھ کے دوا پر یقین ہے
مجھ سے وسیلہ چھوڑ، وسائل پہ بات کر
آ میرے ساتھ بیٹھ، مرے ساتھ چائے پی
آ میرے ساتھ میرے دلائل پہ بات کر
سردار ہیں جو آج، وہ غدار تھے کبھی
جا اِن سے اِن کے دورِ اوائل پہ بات کر
واصفؔ بھی سالکوں کے قبیلے کا فرد ہے
واصفؔ سے عارفوں کے شمائل پہ بات کر

جو نباتات و جمادات پہ شک کرتے ہیں
اے خدا! تیرے کمالات پہ شک کرتے ہیں
وہ جو کہتے ہیں دھماکے سے جہاں خلق ہوا
درحقیقت وہ سماوات پہ شک کرتے ہیں
میں بھی بچپن میں تفکر پہ یقیں رکھتا تھا
میرے بچے بھی روایات پہ شک کرتے ہیں
میں اُسی شہر میں آنسو لیے پھرتا ہوں جہاں
پیڑ چڑیوں کی مناجات پہ شک کرتے ہیں
اپنے حصے میں وہ بے فیض صدی ہے جس میں
لوگ ولیوں کی کرامات پہ شک کرتے ہیں
اس لیے ہم پہ گزرتی ہے قیامت ہر دن
ہم قیامت کی علامات پہ شک کرتے ہیں
آپ کے کھیت میں اُگتی ہے سنہری گندم
آپ کیوں اُس کی عنایات پہ شک کرتے ہیں؟
جن کو موسیٰ کا پتہ ہے نہ خبر طور کی ہے
ایسے بدبخت بھی تورات پہ شک کرتے ہیں
آپ جھرنوں کی تلاوت کو نہیں سن سکتے
آپ فطرت کے اشارات پہ شک کرتے ہیں
''عشق کی عین'' کا تو دشت میں مدفن ہی نہیں
عاشقاں یونہی خرابات پہ شک کرتے ہیں
صرف شاعر ہی نہیں ہوں، میں مسلمان بھی ہوں
آپ کیوں میری عبادات پہ شک کرتے ہیں؟
آپ کو چاہیے سقراط کے بارے میں پڑھیں
آپ واصفؔ کے خیالات پہ شک کرتے ہیں

جبر نے جب مجھے رُسوا سرِ بازار کیا
صبر نے میرے مجھے صاحبِ دستار کیا
میری لفظوں کی عمارت گری کام آئی مرے
میری غزلوں نے مرے نام کو مینار کیا
اپنے ہاتھوں میں کدورت کی کدالیں لے کر
میرے اپنوں نے مری ذات کو مسمار کیا
یاد جب آیا کوئی وعدۂ تعمیر مجھے
میں نے تب جسم کی ہر پور کو معمار کیا
اور پھر سبز اشارہ ہوا اُس پار سے جب
میں نے اک جست میں دریائے بلا پار کیا
آج پھر خاک بہت روئی لپٹ کر مجھ سے
آج پھر قبر نے بابا کی مجھے پیار کیا
چاند نے رات مرے ساتھ مرے دُکھ بانٹے
صبح سورج نے بھی گریہ سرِ دیوار کیا
آگ اشجار کو لگنے سے کئی دن پہلے
میں نے رو رو کے پرندوں کو خبردار کیا
ایسا ماتم کبھی دریا کا نہ دیکھا نہ سنا
جانے کس پیاس نے پانی کو عزادار کیا
جب ہوا دینے لگی ٹھنڈے دلاسے مجھ کو
کچھ چراغوں نے بھی افسوس کا اظہار کیا
دیکھ کر جلتی ہوئی جھونپڑی کل شب واصفؔ
میں نے سوئے ہوئے درویش کو بیدار کیا

جو میری غزلوں کی تنزیل کا معاملہ ہے
وہ میرا اور مرے جبریل کا معاملہ ہے
بنا رہا ہوں میں کاغذ پہ لفظ لفظ کھنڈر
دلِ تباہ کی تمثیل کا معاملہ ہے
میں کیا بتاؤں مرے اشک چھپ رہے ہیں کہاں
یہ میری آنکھ کی زنبیل کا معاملہ ہے
چراغِ طور ترا تذکرہ عبث ہے یہاں
یہاں تو غار کی قندیل کا معاملہ ہے
اِدھر بھی پیشوا تعداد میں زیادہ ہیں
اُدھر بھی چار اناجیل کا معاملہ ہے
ہر اک بدن کی اکائی ہے دو میں پوشیدہ
یہ کائنات کی تکمیل کا معاملہ ہے
یہ ہم جو ہو کے مکمل بھی نامکمل ہیں
خدا کے حکم کی تعمیل کا معاملہ ہے
ملا ہے آدم و حوا کو نصف نصف وجود
یہ سارے دہر کی تشکیل کا معاملہ ہے
اُس آدھے پن کی ضروری ہے پوری پوری سمجھ
جو پورے پن کی تفاصیل کا معاملہ ہے
بسر رہا ہے غزل تیس سال سے واصفؔ
یہ مت سمجھ کہ یہ تعجیل کا معاملہ ہے

طیبہ مرزا/سرائے عالمگیر

طیبہ مرزا کی غزل سراسر جذبے، وفا، اور داخلی کرب کی شاعری ہے۔ان کا سادہ مگر اثر انگیز لہجہ قاری کو فوراً اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔غزل کا مرکزی موضوع عشق ہے مگر وہ سطحی تعریف والا عشق نہیں، بلکہ وہ جس میں عقیدت بھی ہے، شکوہ بھی، اور کہیں کہیں ہلکی سی بد دعا کی کسک بھی۔(احمد ندیم رفیع)

ٹوٹے دل ، کانپتی صدا کے ساتھ
تیرے غم بانٹے ہیں خدا کے ساتھ
ایک دیپک سے عشق کے باعث
میرا جھگڑا رہا ہوا کے ساتھ
تجھ سے رشتہ وہی ہو میرا بھی
جو علیؑ کا تھا فاطمہ سؑ کے ساتھ
روکنا رسمِ عشق ہے ورنہ!
کون رکتا ہے اک صدا کے ساتھ
اس لئے ہے مرے خلاف ہوا
میں چلی جو نہیں ہوا کے ساتھ
مر رہی ہوں فراق میں تیرے
زندہ کر دے مجھے لگا کے ساتھ
خوش رہے وہ جہاں کہیں بھی رہے
اس کو رخصت کیا دعا کے ساتھ

کر دیا قصہ ہی معدوم وہ سارا ہم نے
کس کو دل بولا کسے جان پکارا ہم نے
چاہتیں ، وقت ، وفا ، نیند ، بھروسہ ، غزلیں
ایسا کیا تھا جو ترے سر سے نہ وارا ہم نے
خوش نما ، زہرہ جبیں ، جانِ سخن ، جانِ ادا
تجھ کو کتنے ہی قرینوں سے پکارا ہم نے
بعد از نورِ خدا تیرگی ہے ، بتلایا
ایک مُلحِد کا یوں ایمان نکھارا ہم نے
ایک خامی بھی تمھاری نہ بتائی کسی کو
دور رہ کے بھی بھرم رکھا تمھارا ہم نے

زیرِ فلک ہے کوئی نہ زیبِ زمیں کوئی
تجھ سا حَسِین شخص جہاں میں نہیں کوئی
تسکین ملتی ہے دلِ بے تاب کو بہت
جب چومتا ہے پلکوں سے میری جبیں کوئی
عہد وفا فُلاں سے فُلاں سے بھی
اے شخص تیرا بھی نہیں ایمان و دیں کوئی
اس واسطے کہ میری اذیت کو سمجھے تو
تیرا بھی کاش توڑے مری جاں، یقیں کوئی
بچھڑا تھا تو جہاں پہ بڑے ہی تپاک سے
تکتا ہے راستہ ترا اب بھی وہیں کوئی

میری آنکھوں کو روشنائی دے
سامنے آ ، مجھے دکھائی دے
یا تو پوری طرح حصار میں لے
یا مکمل مجھے رہائی دے
عشق میں یہ کمال بھی ہو کبھی
تجھ کو سوچوں تو تُو دکھائی دے
مجھ کو زینب سی بیٹی دے یا رب
پھر اسے غازی جیسا بھائی دے
شوقِ بیگانگی بہت ہو گیا
اب کوئی داغِ آشنائی دے

ہم نئے شہر میں آئے ہیں بھلانے ان کو
اب تو لوٹیں گے لگا کر ہی ٹھکانے ان کو
وہ جنھیں دیکھے بنا پل نہ گزرتا تھا کبھی
کٹ گئے دیکھے بنا کتنے زمانے ان کو
یاد آئیں گے انھیں اپنے کیے دھوکے بھی
جب دکھائے گا کوئی خواب سہانے ان کو
اب کسی اور سے ہوں گے وہ محبت میں خفا
جائے گا اور کوئی اب کہ منانے ان کو
جان جائیں گے کہ ہوتے ہیں حوالے بھی سزا
جب کوئی دے گا مرے نام کے طعنے ان کو
جب نشہ اترے گا شہرت کا تو یاد آئیں گے
یاد آئیں گے یہی لوگ پرانے ان کو

کوئی محسن ، کوئی رفیق نہیں
زندگی یہ سلوک ٹھیک نہیں
گر وہ پوچھیں مری طبیعت کا
میرے قاصد بتانا ، ''ٹھیک نہیں''
مانگ کر کس لیے میں لوں اس سے؟
یہ محبت ہے کوئی بھیک نہیں
سکھ کا ساتھی جہان سارا ہے
دکھ میں میرے کوئی شریک نہیں
کان ہم ہی نہ دھرتے تھے ورنہ
لوگ تو کہتے تھے تو ٹھیک نہیں
میں اگر عام سا نگینہ ہوں
یار تو بھی کوئی عقیق نہیں
ہجر میں کیوں نڈھال ہیں دونوں؟
گر محبت میں ہم فریق نہیں؟

CS CamScanner

بقیہ انٹرویو: ڈاکٹر رابعہ سرفراز

ارژنگ: خواتین کی ادب میں شرکت کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟

رابعہ سرفراز: ادب میں خواتین علیحدہ ڈبہ نہیں ہے۔ان کو تعصب کی نگاہ سے نہ دیکھا جائے۔فیصل آباد کا ادبی ماحول خواتین تخلیق کاروں کے لئے بہت سازگار ہے۔

ارژنگ: آپ ریڈیو ٹی وی کی ادبی کارکردگی سے مطمئن ہیں؟

رابعہ سرفراز: ریڈیو پاکستان نوجوان ادیبوں کو آگے لانے کے لئے بہت اہم کردار ادا کر رہا ہے۔ ریڈیو سے بہت اچھے اچھے لکھنے والوں نے آغاز کیا تھا۔ٹی وی سے یہ گلہ ہے کہ وہ مزاحیہ مشاعرے سناتا ہے۔سنجیدہ مشاعروں کی تعداد بہت کم ہوتی ہے۔ خواتین کی نمائندگی بہت کم ہے۔خالصتاً خواتین شاعروں کا مشاعرہ آج تک ٹی وی پر نہیں آیا۔پی ٹی وی کو اس طرف توجہ دینی چاہیئے۔

ارژنگ: نظم میں آپ کے پسندیدہ شاعر کون سے ہیں؟

رابعہ سرفراز: ثمینہ راجہ، حمید شاہد اور ڈاکٹر یاسین آفاق۔

ارژنگ: کیا نثری نظم با قاعدہ شاعری ہے؟

رابعہ سرفراز: میرا خیال ہے کہ یہ بحث اب ختم ہو جانی چاہیے۔نثری نظم کے حوالے سے بہت بحث ہو چکی ہے۔اسے اب با قاعدہ ادبی صنف کے طور پر مان لیا گیا ہے۔شروع میں تو آزاد نظم پر بھی اعتراضات ہوئے تھے۔نثری نظم میں صرف خیال کو اہمیت دی جاتی ہے۔Form پر بحث نہیں ہوتی۔آزاد نظم میں تو با قاعدہ بحر بھی ہوتی ہے۔جو لوگ نثری نظم کو نہیں مانتے وہ اصل میں دل سے اسے مانتے ہیں۔کیونکہ کسی کو ماننے کی ابتدا اسے نہ ماننے سے ہی ہوتی ہے۔

ارژنگ: کیا آپ شاعری کے لئے با قاعدہ وقت نکالتی ہیں؟

رابعہ سرفراز: جی نہیں شاعری اپنے لئے خود وقت نکال لیتی ہے۔کوئی جاب یا دیگر مصروفیت شاعری پر اثر انداز نہیں ہوتی۔

ارژنگ: آپ اپنے تخلیقی ادب کے بارے میں کیا کہتی ہیں؟

رابعہ سرفراز: میرا تخلیقی ادب متعدد اصناف پر مشتمل ہے، جن میں نثری نظم، بچوں کے لیے نظمیں، پابند اور آزاد شاعری، نیز غزل شامل ہیں۔ ہر صنف میرے تخلیقی سفر کا ایک منفرد مرحلہ اور ایک الگ فکری تجربہ ہے، مگر ان سب کی داخلی ساخت میں ایک ہی تخلیقی روح کارفرما ہے۔ایک تخلیق کار کے لیے تخلیق محض لفظی ترتیب نہیں بلکہ وہ اس کے باطن کی آواز، اس کے شعور کی تہوں میں پنہاں سوالات اور اس کی روحانی کیفیات کی بازگشت ہوتی ہے۔ اسی لیے مجھے اپنی شاعری محض محبوب نہیں بلکہ اپنی ذات کا توسیعی اور بامعنی اظہار محسوس ہوتی ہے۔میری تخلیق ان لمحوں کی عطا ہے جب میں اپنے وجود، کائنات اور انسان کی معنوی حیثیت پر گہرے غور وفکر میں محو ہوتی ہوں۔ یہ لمحے کسی طے شدہ منصوبے یا ارادے کے تابع نہیں ہوتے بلکہ ایک داخلی اضطراب، ایک خاموش فکری کشمکش اور ایک روحانی مکالمے کی صورت میں خود کو منکشف کرتے ہیں۔انہی لمحات میں تخلیق میرے لیے کتھارسس کا ذریعہ بھی بنتی ہے اور اظہار کا وسیلہ بھی۔ جو باتیں زبان ادا نہیں کر پاتی، وہ شعر کا پیکر اختیار کر لیتی ہیں اور جو احساسات بیان سے ماورا ہوتے ہیں، وہ نظم کی صورت میں ڈھل جاتے ہیں۔ بچوں کے لیے لکھی گئی شاعری میں میری کوشش یہ رہی ہے کہ سادگی، معصومیت اور تخیل کی تازگی برقرار رہے، کیونکہ بچوں کا ذہن پیچیدہ علامتوں سے زیادہ معنوی شفافیت اور جذبے کی صداقت سے مکالمہ کرتا ہے۔ نثری نظم میں میں نے داخلی کیفیات، نسائی شعور اور عصری حسیت کو علامتی اور تجریدی اسلوب میں برتنے کی سعی کی ہے، جب کہ غزل میں ذاتی تجربے اور احساس کو مرکزی اہمیت دی ہے۔یوں میرا تخلیقی ادب محض ادبی مشق یا جمالیاتی تجربہ نہیں بلکہ ایک مسلسل فکری، روحانی اور تخلیقی سفر ہے، جس میں تخلیق میری شناخت بھی ہے اور میرا اعترافِ ذات بھی۔

ارژنگ: شعر وادب کی ترویج میں مشاعرے کی اہمیت اور کردار کیا ہے؟

رابعہ سرفراز: شعر وادب کی ترویج میں مشاعرے ایک مؤثر، فعال اور تہذیبی ادارے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ مشاعرہ محض اشعار کی قرأت کا نام نہیں بلکہ یہ زبان و بیان کی لطافت، فکری بالیدگی اور جمالیاتی شعور کی اجتماعی تربیت کا ایک معتبر وسیلہ ہے۔ برصغیر کی ادبی روایت میں مشاعروں نے نہ صرف کلاسیکی شعرا کے کلام کو عوام تک پہنچایا بلکہ نئے اور ابھرتے ہوئے شعرا

کو بھی اظہار کا پلیٹ فارم فراہم کیا۔ اس طرح یہ روایت ادبی تسلسل اور تخلیقی ارتقا کا سبب بنتی رہی ہے۔ مشاعرے نوجوان نسل کی تہذیبی و اخلاقی تربیت میں بھی اہم کردار ادا کرتے ہیں، کیونکہ ایسی محفلوں میں سننے، سمجھنے، گفتگو کرنے اور اختلافِ رائے کو مہذب انداز میں پیش کرنے کا سلیقہ پیدا ہوتا ہے۔ زبان کی شائستگی، لہجے کی نرمی اور اظہار کی نفاست انہی ادبی نشستوں میں پروان چڑھتی ہے۔ اسی تناظر میں ہم اپنے شعبے کے زیرِ اہتمام وقتاً فوقتاً قومی سطح کے معیاری مشاعروں کا انعقاد کرتے ہیں، تاکہ طلبہ میں شعری ذوق و شوق کو جلا ملے، ان کی فکری آبیاری ہو اور وہ اپنی ادبی روایت سے جڑے رہیں۔ اس طرح مشاعرہ محض ایک تقریب نہیں بلکہ ایک زندہ تہذیبی عمل بن جاتا ہے جو ادب کی بقا اور فروغ کا ضامن ہے۔

ارژنگ: کیا یہ تاثر درست ہے کہ الیکٹرانک میڈیا کی وجہ سے کتاب سے دوری کا رواج عام ہوتا چلا جا رہا ہے؟

رابعہ سرفراز: یہ تاثر بظاہر درست محسوس ہوتا ہے کہ الیکٹرانک میڈیا نے مطالعہ کتب کی روایت کو متاثر کیا ہے، کیونکہ فوری اور بصری ابلاغ نے انسانی توجہ کے زاویے بدل دیے ہیں۔ تاہم یہ کہنا کہ کتاب اپنی معنویت کھو چکی ہے، ایک سطحی اور عجلت پسندانہ رائے ہوگی۔ سنجیدہ اور فکری قاری آج بھی کتاب ہی کو علم و آگہی کا معتبر ترین وسیلہ سمجھتا ہے۔ کتاب انسان کو محض اطلاع نہیں دیتی بلکہ اس کی داخلی تشکیل اور فکری بالیدگی کا سامان بھی کرتی ہے۔ الیکٹرانک میڈیا وقتی تاثر اور تفریح فراہم کرتا ہے، جبکہ کتاب شعور کی تہہ داری اور احساس کی گہرائی عطا کرتی ہے۔ مطالعہ ایک خاموش مکالمہ ہے جو قاری اور مصنف کے درمیان زمان و مکان کی حدوں سے ماورا ہو کر قائم ہوتا ہے۔ یہی مکالمہ ذہنی یکسوئی، تنقیدی بصیرت اور فکری استقلال کو پروان چڑھاتا ہے۔ اس لیے کہا جا سکتا ہے کہ ذرائع بدل سکتے ہیں، مگر علم اور کتاب سے حقیقی وابستگی کبھی ماند نہیں پڑتی۔

ارژنگ: کیا آپ کسی ادبی تحریک کا حصہ رہی ہیں؟ اور کیا اہلِ قلم کو سیاست میں حصہ لینا چاہیے؟

رابعہ سرفراز: میں براہِ راست کسی باقاعدہ ادبی تحریک سے وابستہ نہیں رہی، تاہم ادبی و فکری مباحث میں شرکت اور علمی سرگرمیوں میں حصہ لینا ہمیشہ میری ترجیح رہا ہے۔ میرا یقین ہے کہ ادیب کی اصل وابستگی کسی مخصوص تحریک سے زیادہ، سچائی، شعور اور انسانی قدروں سے ہوتی ہے۔ ادیب اپنے عہد کا حساس نباض ہوتا ہے؛ وہ معاشرتی تغیرات کو محسوس بھی کرتا ہے اور اپنے تخلیقی اظہار کے ذریعے ان کی ترجمانی بھی کرتا ہے۔ جہاں تک اہلِ قلم کے سیاست میں حصہ لینے کا سوال ہے تو یہ ایک نہایت اہم اور نازک موضوع ہے۔ اہلِ قلم چونکہ باشعور اور صاحبِ نظر طبقہ ہوتے ہیں، اس لیے قومی اور سماجی معاملات پر ان کی رائے وزن رکھتی ہے۔ وہ اپنی تحریروں کے ذریعے اجتماعی شعور کی تشکیل اور اصلاح میں کردار ادا کر سکتے ہیں۔ علامہ محمد اقبال نے کہا تھا: ''جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی'' اس شعر میں سیاست کو اخلاقی اور روحانی اقدار سے وابستہ رکھنے کی تلقین کی گئی ہے۔ تاہم براہِ راست عملی سیاست میں شمولیت کرنا یا نہ کرنا ہر ادیب کا ذاتی فیصلہ ہے۔ بعض اہلِ قلم نظری اور فکری سطح پر رہ کر زیادہ مؤثر کردار ادا کرتے ہیں، جبکہ کچھ عملی میدان میں اتر کر تبدیلی کی کوشش کرتے ہیں۔ اصل اہمیت اس امر کی ہے کہ ادیب اپنی فکری دیانت، اخلاقی جرات اور سماجی ذمہ داری کو برقرار رکھے۔

ارژنگ: اپنی تخلیقات کے بارے میں بتائیں؟ آپ کو اپنی کون سی کتاب زیادہ پسند ہے؟

رابعہ سرفراز: ایک تخلیق کار کے لیے اس کی ہر تخلیق اس کے باطن کا حصہ اور اس کے فکری سفر کی ایک منزل ہوتی ہے۔ ہر کتاب اپنے پس منظر، موضوع اور زمانی و سماجی تناظر کے اعتبار سے ایک الگ تجربہ اور داخلی کیفیت کی آئینہ دار ہوتی ہے۔ میری تحریروں میں تنقیدی شعور، تہذیبی آگہی اور ادبی روایت سے مکالمہ بنیادی عناصر کی حیثیت رکھتے ہیں، اور میں نے ہمیشہ کوشش کی ہے کہ تحقیق اور تخلیق دونوں میں فکری دیانت اور اسلوبیاتی سنجیدگی برقرار رہے۔ جہاں تک کسی ایک کتاب کو زیادہ پسند کرنے کا تعلق ہے تو یہ انتخاب میرے لیے آسان نہیں۔ تخلیقات کی جہات مختلف ہو سکتی ہیں — کسی میں تحقیقی کاوش زیادہ نمایاں ہے، کسی میں فکری تجزیہ اور کسی میں اسلوبیاتی تجربہ — مگر ان کی قدر و قیمت میرے نزدیک یکساں ہے۔ ہر کتاب ایک خاص عہد، ایک مخصوص ذہنی کیفیت اور ایک جداگانہ علمی جستجو کی نمائندگی کرتی ہے، اس لیے ان میں سے کسی ایک کو فوقیت دینا گویا اپنے ہی فکری سفر کے کسی مرحلے کو نظرانداز کرنا ہوگا۔ کم از کم میری ذات کے لیے تمام تخلیقات یکساں محبت اور اہمیت کی حامل ہیں۔

بقیہ انٹرویو: مظہر سلیم مجوکہ

ارژنگ: آپ کا ادبی سفر کہاں سے شروع ہوا؟ ابتدائی مطالعہ اور کن شخصیات نے آپ کی فکری تشکیل میں بنیادی کردار ادا کیا؟

مظہر سلیم مجوکہ: ادبی سفر میں ابتدائی مطالعہ سکول کے زمانے سے ہی شروع ہو گیا تھا۔ اُس زمانے میں سکول میں ایک پیریڈ ہر ہفتے بزمِ ادب کے طور پر ہوتا تھا۔ حاصل مطالعہ کے عنوان سے ایک نوٹ بک بھی تیار کرائی جاتی تھی۔ اساتذہ بھی ادبی ذوق رکھتے تھے۔ اخبارات میں بچوں کا صفحہ بھی شائع ہوتا تھا، قلمی دوستی بھی کی جاتی تھی۔ ''نونہال'' تعلیم و تربیت اور ''کھلونا'' بھی باقاعدگی سے زیرِ مطالعہ رہتا تھا۔ میٹرک تک آتے آتے اپنے نانا جان مرحوم ملک شہباز خان کے ذاتی کتابی ذخیرے سے آبِ حیات، مقدمہ ابن خلدون، سیرت ابن ہشام کا مطالعہ کر لیا تھا۔ عبدالحلیم شرر کے ناول اور نسیم حجازی کے ناول بھی پڑھ ڈالے تھے۔ ملتان میں ہمارے سکول کے سامنے بھی ایک لائبریری تھی جہاں ایک حافظ صاحب کرائے پر کتابیں دیا کرتے تھے، وہاں سے ایک آنے میں ہر روز کتاب لے کر پڑھتے تھے۔ ابنِ صفی، دت بھارتی، گلشن نندہ کا مطالعہ اُسی لائبریری سے کیا۔ ابن صفی کی تقریباً تمام کتابیں پڑھی ہیں۔ ''آبِ حیات'' نے شاعری کا ذوق پیدا کیا اور تفسیر ابن کثیر اور سیرت ابن ہشام نے مذہب سے وابستگی میں بڑا کردار ادا کیا۔ کالج میں ٹٹوریل گروپ میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ سٹیج ڈراموں میں بھی کردار ادا کیے۔ میری فکری تشکیل میں کتابوں اور میرے مرحوم نانا جان اور بعد ازاں سید قاسم محمود نے کردار ادا کیا۔

ارژنگ: مدیر، پبلشر اور قاری ان تین حیثیتوں میں آپ خود کو کس روپ میں زیادہ مطمئن پاتے ہیں اور کیوں؟

مظہر سلیم مجوکہ: بطور مدیر، پبلشر اور قاری کے میں خود کو بہ طور قاری زیادہ مطمئن پاتا ہوں۔

ارژنگ: ادبِ لطیف جیسے تاریخی اور معتبر ادبی رسالے کی ادارت سنبھالنا یقیناً ایک بڑا چیلنج ہے۔ آپ کے نزدیک اس کی سب سے بڑی ذمہ داری کیا ہے؟

مظہر سلیم مجوکہ: ادبِ لطیف کی ادارت سنبھالنا واقعی ایک بہت بڑا چیلنج تھا۔ 1935ء سے جاری اس ادبی رسالے کی ادارت بہت بڑے بڑے ادیبوں نے کی تھی۔ میں نے اس چیلنج کو قبول کیا اور الحمدللہ اپنی ذمہ داریوں سے بہ احسن عہدہ برا ہوتا ہوں۔ کوشش ہے کہ اس کا ہر شمارہ خاص شمارہ ہو۔ قارئین کی پسندیدگی اور دورِ حاضر کے ہر بڑے ادیب اور شاعر کا اس میں شائع ہونا ہی میرے لیے اعزاز ہے۔

ارژنگ: کیا آپ سمجھتے ہیں کہ ادبِ لطیف نے بدلتے ادبی رجحانات کے باوجود اپنی شناخت برقرار رکھی ہے؟ اس تسلسل کا راز کیا ہے؟

مظہر سلیم مجوکہ: ادبِ لطیف نے بدلتے ادبی رجحانات کے باوجود اپنی ایک علیحدہ شناخت برقرار رکھی ہے۔ محنت اور صرف محنت ہی اس کے تسلسل کا راز ہے۔ مضامین کی چھان پھٹک میں بڑی عرق ریزی سے کام لیا جاتا ہے۔ بعض احباب سے کہہ کر مضامین لکھوائے جاتے ہیں۔ الحمدللہ قریباً پانچ شماروں کا مواد ہر وقت موجود رہتا ہے۔ کوشش کی جاتی ہے کہ رسالہ بروقت شائع ہو کر قارئین تک پہنچے۔ سرورق پر بھی خاص توجہ دی جاتی ہے۔

ارژنگ: آج کے دور میں ادبی رسائل کو کن بنیادی مسائل کا سامنا ہے اور ان کا حل آپ کیسے دیکھتے ہیں؟

مظہر سلیم مجوکہ: آج کے دور میں ادبی رسائل کو گوناگوں مسائل کا سامنا ہے۔ ادبی رسالے کو کوئی اشتہار نہیں ملتا۔ سالانہ خریداری کا رجحان بھی بہت کم ہے۔ ڈاک کا خرچہ بھی ناقابلِ برداشت ہے۔ اس کا واحد حل یہ ہے کہ ادبی رسائل کی سالانہ خریداری قبول کی جائے۔ حکومت کو چاہیے کہ اخبارات کی طرح ادبی رسائل کو بھی اشتہارات ماہانہ بنیادوں پر دیے جائیں اور کتابوں اور رسائل کے لیے کاغذ کی قیمتوں میں کمی کی جائے۔

ارژنگ: بطور مدیرِ اعلیٰ بک ڈائجسٹ آپ سنجیدہ ادب اور عوامی ذوق کے درمیان توازن کیسے قائم رکھتے ہیں؟

مظہر سلیم مجوکہ: بہ طور مدیرِ اعلیٰ ''بک ڈائجسٹ'' 2004ء سے جب اس ڈائجسٹ کا اجراء ہوا۔ میری خواہش تھی اس میگزین کو کتابوں کے لیے وقف کر دوں یعنی اس میں صرف کتابوں پر تبصرہ شائع ہو اور قارئین کو نئی کتابوں سے آگاہی دی جائے۔ ابتدا میں قریباً چار شماروں میں ایک ایک مکمل کتاب بھی شائع کی گئی۔ چند شماروں میں اعلیٰ ادب بھی شائع کیا گیا جن میں ہر قسم کے قاری کے ادبی ذوق کا خیال رکھا گیا۔ ازاں بعد اس میگزین کو شخصیات نمبرز کے لیے مخصوص کر دیا گیا اور اب تک سولہ زندہ شخصیات کے خصوصی نمبرز شائع ہو چکے ہیں جن میں انور جمال نمبر، حفیظ خان نمبر، اکرم عتیق نمبر، عبدالحکیم ملک نمبر، جمیل احمد عدیل نمبر، شفیق آصف نمبر، اعظم کمال نمبر، محمد حمید شاہد نمبر، کرامت گردیزی نمبر، اشرف جاوید نمبر، انور ندیم علوی نمبر، ڈاکٹر انور زاہدی نمبر، ڈاکٹر فرحت عباس نمبر، جاوید یاد نمبر، سہیل ساجد نمبر اور سید الطاف بخاری نمبر شائع ہو کر قارئین سے پذیرائی حاصل کر چکے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ سال میں چند شمارے ادبی تحاریر کے لیے بھی مختص کیے جاتے ہیں۔

CS CamScanner

ارژنگ: کیا آپ کے نزدیک ڈائجسٹ ادب کم تر سمجھنا درست ہے یا یہ ادبی تنوع کا ایک اہم حصہ ہے؟

مظہر سلیم مجوکہ: ڈائجسٹ ادب کو ہرگز کم تر نہیں سمجھنا چاہیے۔ یہ ادبی تنوع کا ایک اہم حصہ ہے۔ ان سے کئی خواتین ناول نگار، افسانہ نگار اُبھر کر سامنے آئیں اور شکیل عادل زادہ کے سب رنگ ڈائجسٹ نے تو کمال کر دیا تھا۔

ارژنگ: کتاب ورثہ کے قیام کا بنیادی مقصد کیا تھا اور آپ اسے کن خطوط پر آگے بڑھانا چاہتے ہیں؟

مظہر سلیم مجوکہ: کتاب ورثہ کا بنیادی مقصد کتابوں کی دیدہ زیب اشاعت سے زیادہ ایک بااعتماد ادارہ قائم کرنا تھا۔ الحمدللہ اس ادارے نے بہت کم وقت میں اشاعتی دنیا میں اپنا مقام بنا لیا ہے۔ اب تک قریباً بائیس 22 کتابیں اس ادارے سے شائع ہو چکی ہیں۔ میری خواہش ہے کہ اس ادارے سے کم قیمت اور معیاری کتابیں شائع ہوں۔

ارژنگ: پاکستان میں پبلشنگ انڈسٹری کو درپیش سب سے بڑا مسئلہ آپ کے نزدیک کیا ہے؟

مظہر سلیم مجوکہ: پاکستان میں پبلشنگ انڈسٹری کو بہت سے مسائل کا سامنا ہے۔ کاغذ اور پرنٹنگ کی گرانی کی وجہ سے کتابوں کی قیمتیں آسمان سے باتیں کر رہی ہیں۔ مزید برآں ابھی کتاب چھپ کر مارکیٹ میں آتی ہی ہے کہ اُس کی پی ڈی ایف کاپی تیار ہو کر لوگوں تک پہنچ جاتی ہے۔ پرانی اور نایاب کتابوں کی حد تک تو پی ڈی ایف گوارا ہے مگر نئی کتاب کے ساتھ تو یہ ظلم ہے۔

ارژنگ: نئے لکھنے والوں کی اشاعت کے حوالے سے آپ کی پالیسی کیا ہے؟

مظہر سلیم مجوکہ: ادب لطیف میں ہم پرانے لکھنے والوں کے ساتھ ساتھ نئے لکھنے والوں کی تحاریر کو بھی بھرپور جگہ دیتے ہیں۔ ادب صرف بڑے شہروں میں ہی نہیں مضافات میں بھی بہت عمدہ لکھا جا رہا ہے۔ ہم نئے اور نوجوان لکھنے والوں کی بھی پذیرائی کرتے ہیں۔

ارژنگ: آپ کے ذاتی کتب خانے کے بارے میں سنا جاتا ہے کہ وہ ایک علمی خزانہ ہے۔ کتاب سے آپ کا رشتہ کیا معنی رکھتا ہے؟

مظہر سلیم مجوکہ: میرے ذاتی کتب خانے میں ہزاروں کتابیں موجود ہیں۔ کتابوں کو خرید کر پڑھنے کا شوق مجھے سکول کے زمانے سے ہی ہو گیا تھا۔ شاعری کی کتابوں کا زیادہ ذخیرہ ہے۔ ان سے کالج اور یونیورسٹی کے طلباء و طالبات استفادہ کرتے ہیں تو مجھے بہت خوشی ہوتی ہے۔ میں کھانے اور نئے کپڑوں اور نئے جوتوں کے بغیر تو زندہ رہ سکتا ہوں مگر کتاب کے بغیر نہیں۔

بچپن میں جب والدین نئے جوتوں اور کپڑوں کے لیے رقم دیتے تھے تو میں کتابیں خرید لیتا تھا۔

ارژنگ: آج کے ڈیجیٹل دور میں نوجوانوں کو کتاب سے جوڑنے کے لیے کیا عملی اقدامات ضروری ہیں؟

مظہر سلیم مجوکہ: آج کا دور سوشل میڈیا کا دور ہے اور نوجوان نسل کتاب سے دور ہوتی جا رہی ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ سکولوں اور کالجوں میں بزمِ ادب کا ایک پیریڈ لازمی رکھا جائے اور بچوں کو کتاب کی طرف مائل کیا جائے۔ ہر شہر میں لائبریریوں کا قیام عمل میں لایا جائے۔

ارژنگ: نامور محقق اور پبلشر سیّد قاسم محمود کے ساتھ کام کرنے کا تجربہ کیسا رہا؟ ان سے آپ نے کون سے فکری، تحقیقی یا عملی اسباق سیکھے جو آج بھی آپ کے کام میں جھلکتے ہیں؟

مظہر سلیم مجوکہ: ادیب، مدیر، دانش ور، ناشر سیّد قاسم محمود صحیح معنوں میں میرے ادبی راہنما ہیں۔ میرا اُن سے تعلق کالج کے ابتدائی دور میں ہی ہو گیا تھا۔ جب انہوں نے ''معلومات'' کے نام سے ایک رسالہ جاری کیا تھا۔ پھر انہوں نے 1975ء میں شاہکار ارزاں اور معیاری کتابوں کے حوالے سے لاجواب کام کیا۔ جس دور میں کتابیں نہایت مہنگی شائع ہو رہی تھیں انہوں نے رسالے کی صورت میں نہایت کم قیمت اور اعلیٰ کتابیں شائع کیں۔ وہ بابائے انسائیکلوپیڈیا تھے۔ میں نے ان سے بہت کچھ سیکھا۔ افسوس ہماری قوم اور حکومتوں نے ان کی قدر ہی نہیں کی۔ ان کو زندگی میں اور بعد از مرگ بھی کسی قومی ایوارڈ سے نہیں نوازا گیا اور ان سے بہت کم تر لوگوں کو اعزازات بانٹ دیے گئے۔

میں نے ان سے بڑا پاکستانی ادیب نہیں دیکھا۔ پاکستان اور بانئ پاکستان کے خلاف کوئی بات برداشت نہیں کرتے تھے۔ سیارہ ڈائجسٹ کے بانی مدیر تھے اور ''شہاب نامہ'' از قدرت اللہ شہاب اور ''لبیک'' از ممتاز مفتی، انہوں نے سیارہ میں بالاقساط شائع کیں اور بعد میں یہ کتابی صورت میں شائع ہوئیں۔ میں نے ان سے یہ سیکھا کہ اخباری اور ادبی تنظیموں سے حتی الوسع دوری ہی مناسب ہے۔ ہر بڑے ادیب کی ہر تحریر معیاری نہیں ہوتی۔ بعض اوقات وہ اختلافی یا کم تر درجے کی تحریر بھی جریدے کو بھیج دیتے ہیں جو شائع نہیں ہو سکتی۔ میں نے ان سے پابندیِ وقت کی اہمیت بھی سیکھی۔

کہتے تھے خاموشی سے محنت کیے جاؤ، کامیابی خود ہی تمہیں عروج دے گی۔ ان کی زندگی میں تک ڈائجسٹ کا ''سید قاسم محمود نمبر'' شائع کیا تھا۔ تک ڈائجسٹ اب سید قاسم محمود کی یاد میں شائع ہوتا ہے۔

ارژنگ: آج کے پاکستانی ادب کو آپ کس زاویے سے دیکھتے ہیں؟ کیا ہم فکری بحران سے گزر رہے ہیں یا تخلیقی ارتقا سے؟ اور آپ کے نزدیک موجودہ دور کا سب سے بڑا ادبی مسئلہ کیا ہے؟

مظہر سلیم مجوکہ: آج کا پاکستانی ادب دنیا میں اپنی پہچان نہیں بنا سکا۔ چند اچھی کتابیں شائع ضرور ہوتی ہیں مگر زیادہ تر کم تر درجے کا ادب ہی دھڑا دھڑ شائع ہو رہا ہے۔ یہاں اردو بازار لاہور میں اسلامی اور مذہبی کتابیں بہت شائع ہوتی ہیں اور فروخت بھی ہوتی ہیں۔ جب کہ فکشن اور خالص ادب کی کتابیں بہت کم فروخت ہوتی ہیں۔ ضرورت ہے کہ ہماری ادبی

CS CamScanner

کتابوں کے غیر ملکی زبانوں میں تراجم ہوں۔ ہمارے کسی ادیب یا شاعر کو ابھی عالمی ایوارڈ نہیں ملا۔ افسانے کے حوالے سے سیّد قاسم محمود نے کیا خوب بات کی ہے کہ ''افسانہ، معاشرے کا وہ آنسو ہے جو افسانہ نگار کی آنکھ سے ٹپکتا ہے۔''

اس سے آپ خود اندازہ لگالیں کہ ہمارا آج کا ادیب اور افسانہ نگار کہاں کھڑا ہے۔ کیا وہ معاشرے کا صحیح نباض ہے؟

معاشرے میں ہر طرف کہانیاں بکھری پڑی ہیں۔ سیاسی اور معاشی عدم استحکام کو ہمارا ادیب کیوں تحریر نہیں کرتا۔ شاید وہ خوف زدہ ہوگیا ہے کہ کیا لکھے اور کیا نہ لکھے۔ دنیا میں ہر طرف جو ظلم اور ناانصافی ہو رہی ہے اس پر بھی خاموش رہنا پسند کرتا ہے۔

ارژنگ: نئے لکھنے والوں کو آپ کیا مشورہ دیں گے جو اشاعت اور شناخت کے خواہاں ہیں؟

مظہر سلیم مجوکہ: نئے لکھنے والوں کو صرف یہی مشورہ دوں گا کہ وہ جو دیکھیں/محسوس کریں وہ قلم بند کریں۔ اچھی چیز اپنا مقام خود متعین کرالیتی ہے۔ جو بھی لکھیں خود اُس کا جائزہ لیں کہ یہ قابل اشاعت ہے بھی یا نہیں۔ ادیب کو اپنا ناقد بھی خود ہونا چاہیے۔

ارژنگ: کیا آپ سمجھتے ہیں کہ مطالعے کے بغیر اچھی تحریر ممکن ہے؟

مظہر سلیم مجوکہ: اچھا لکھنے کے لیے مطالعہ بہت ضروری ہے۔ اس کے بغیر تحریر میں حُسن پیدا نہیں ہوتا۔ بہت کم لوگ ہوں گے جو خداداد صلاحیتیں لے کر پیدا ہوئے ہوں ورنہ محنت سے ہی تحریر میں خوبی پیدا ہوتی ہے اور نئے موضوعات سے آگاہی ہوتی ہے۔ کتابوں کا انتخاب بھی سوچ سمجھ کر کیا جانا چاہیے۔

ارژنگ: چند ایسی کتابیں یا مصنفین جنھوں نے آپ پر گہرا اثر چھوڑا ہو؟

مظہر سلیم مجوکہ: اس زندگی میں ہزار ہا کتابیں مطالعے میں آئیں۔ مگر بہت کم کتابیں ایسی تھیں جنھوں نے مشامِ جاں کو معطر کیا۔ شاعری زیادہ پڑھی، میر، غالب اور اقبال تو پسند ہیں ہی ناصر کاظمی، احمد مشتاق، فراز، محسن نقوی، پروین شاکر، امجد اسلام امجد، ابنِ انشاء پسند رہے اور بھی بہت سے ہیں۔

ڈاکٹر محمد حمید اللہ کی تحریریں بہت پسند آئیں۔ خصوصاً اُن کی کتاب ''خطباتِ بہاولپور'' لاجواب کتاب ہے۔ نہج البلاغہ بھی باکمال کتاب ہے۔ مثنوی مولانا روم بہت پسند ہے۔

ارژنگ: اگر آپ مدیر نہ ہوتے تو خود کو کس شعبے میں دیکھتے؟

مظہر سلیم مجوکہ: اگر مدیر نہ ہوتا تو صرف قاری ہوتا، کتابیں ہی پڑھتا رہتا۔

ارژنگ: ادب، کتاب اور قاری ان تینوں کے رشتے کو آپ ایک جملے میں کیسے بیان کریں گے؟

مظہر سلیم مجوکہ: ادب کی ہر اچھی کتاب اپنا قاری خود تلاش کر لیتی ہے۔

ارژنگ کے عامر بن علی، حسن عباسی اور لیئق صفدر کا ازحد شکریہ ارژنگ کے لیے جو محنت آپ کی ٹیم کر رہی ہے اس کے لیے آپ سب مبارک باد کے مستحق ہیں۔

ایاز احمد/لاہور

تو باوفا کب تھا، مجھے پاسِ وفا کب تھا
میں تیرا ہی کیوں رہتا، بھلا تو مرا کب تھا

ہونے سے ترے باغِ بہاراں گلِ تازہ
جانے پہ ترے لب پہ بھی شکوہ بھلا کب تھا

تم پاس بلاتے تو سہی آگ جلاتے
دائم تھا پڑا در پہ ترے میں گیا کب تھا

دل ہے ہی کہاں ورنہ دکھاتا تجھے آتش
جلتا رہا شعلہ جو بچا تھا بجھا کب تھا

لے داغِ جگر، دودِ چراغِ دلِ حسرت
ہم جائیں کہاں، آتا بھی اور راستا کب تھا

سننے کو کہاں سنتا ہے دل اپنی ایاز اب
دم تھا جو نکل کر دمِ عیسیٰ بنا کب تھا

✦✦✦

بہ یاد: سید قاسم محمود
ماہنامہ بک ڈائجسٹ لاہور
Book Digest
ISSN 2079-4584
براہ کرم اپنی اردو اور انگریزی تخلیقات (شاعری و نثر)
مدیر اعلیٰ: مظہر سلیم مجوکہ
مدیر: اظہر سلیم مجوکہ
رسالے کے حصول کے لئے
سالانہ زرِ تعاون مبلغ -/2500 روپے
اپنے ڈاک کے پتے اور موبائل نمبر کے ساتھ درج ذیل
جاز کیش، یو پیسہ اکاؤنٹ میں جمع کرایا جا سکتا ہے
0321-4377794
paisa 0333-4377794
Mazhar Saleem Majoka
صوبہ پنجاب کے تمام کالجوں اور پبلک لائبریریوں کیلئے منظور شدہ
042-37322996
0333-4377794
کتاب ورثہ غزنی سٹریٹ، اردو بازار لاہور
برائے خط و کتابت
ترسیل زر/رابطہ
bookdigest@hotmail.com,kitabyirsa@gmail.com

شاعری

رگ و پے میں بسی ہے تنہائی
ہر نفس میں رچی ہے تنہائی

خوش فریبی کے زرد صحرا میں
مثلِ غنچہ کھلی ہے تنہائی

شبِ ہجراں کے آستانے پر
دست بستہ کھڑی ہے تنہائی

چشمِ گریاں کے آبگینوں میں
قطرہ قطرہ گری ہے تنہائی

دُور لرزاں ہے وصل کی منزل
راستے میں بجھی ہے تنہائی

گوشۂ انتظار میں ہر شب
شمع بن کر جلی ہے تنہائی

جیسے طائر ہو زیرِ دامِ سخت
گھر میں کُرلا رہی ہے تنہائی

لے کے پیمانۂ خیالِ یار
پاس بیٹھی ہوئی ہے تنہائی

کیسے چہرے ہیں اردگرد مرے
کس کو بہلا رہی ہے تنہائی

کوئی بیٹھا ہے آ کے پہلو میں
کھلکھلا کر ہنسی ہے تنہائی

تھام کر یادِ رفتگاں کا ہاتھ
سیڑھیوں پر کھڑی ہے تنہائی

میرے شانوں پہ اپنا سر رکھے
دن ڈھلے سو رہی ہے تنہائی

بجھ رہے ہیں چراغ وعدوں کے
وسوسوں سے بھری ہے تنہائی

دلِ وحشت زدہ کو بہلانے
طاقچوں پر دھری ہے تنہائی

شجرِ سایہ دار کے نیچے
تھک کے ستا رہی ہے تنہائی

عدم آباد کے دریچوں سے
روح میں جھانکتی ہے تنہائی

جا چکا کاروانِ ہست و بود
چیختی پھر رہی ہے تنہائی

اشکِ نا آفریدہ کی مانند
پسِ مژگاں چھپی ہے تنہائی

ایک موجِ سراب کی صورت
دشت میں بہہ رہی ہے تنہائی

جیسے ویرانے میں بَبُول کوئی
صحنِ دل میں اُگی ہے تنہائی

بے یقینی کے اندھے کنویں میں
رات بھر چیختی ہے تنہائی

دل کے لاشے پہ ایک گدھ کی طرح
کب سے منڈلا رہی ہے تنہائی

آئنوں کے حصار میں لا کر
مجھ کو سمجھا رہی ہے تنہائی

شہرِ نسیاں سے آ رہے ہیں لوگ
بھیڑ میں کھو گئی ہے تنہائی

خود فراموش ہو گیا ہوں میں
کیا ستم ڈھا رہی ہے تنہائی

طشت ازبام ہو گیا آخر
وہی مجلس، وہی ہے تنہائی

دیکھ آوارگیٔ نکہتِ گل
خوشبوؤں میں گھری ہے تنہائی

کس لئے احتیاطِ وضعِ جنوں
زیرِ لب پوچھتی ہے تنہائی

جب کریدا بھڑک اٹھی پھر سے
راکھ میں یُوں دبی ہے تنہائی

گھر کے تاریک کونوں کھدروں میں
ناگ بن کر چھپی ہے تنہائی

سایۂ زلفِ یار میں دن بھر
در بدر گھومتی ہے تنہائی

صفا مروہ کے درمیاں کب سے
بھاگتی پھر رہی ہے تنہائی

سحر انگیز دیوتا کی طرح
معبدوں میں سجی ہے تنہائی

نسل در نسل نوعِ انساں کے
خون میں دوڑتی ہے تنہائی

جامۂ تار تار ہے دنیا
کارِ بخیہ گری ہے تنہائی

ایک انبوہِ بیکراں کے ساتھ
شہر میں گھس رہی ہے تنہائی

احمد ندیم رفیع/امریکا

پھیلا ہوا ہے سلسلہ فریاد و آہ کا
خمیازہ ہے یہ دنیا مرے ہی گناہ کا

تنہا شجر ہوں اوڑھ کے بیٹھا ہوں رات کو
منظر طلوع ہوگا کبھی صبح گاہ کا

ہر پل بدل رہی ہے جو تصویر اپنا رنگ
جادو گری ہے یا کوئی دھوکا نگاہ کا

ہاں دل کے آس پاس کہیں شہرِ عشق تھا
اب کیا نشان ڈھونڈیے شہرِ تباہ کا

دیجور جس کو حضرتِ جرات بھی کہہ گئے
خوباں کو اب پتا نہیں زلفِ سیاہ کا

اسلم سحاب ہاشمی/ساہیوال

پھوٹتی کلیاں ہمیں یکدم ستانے لگ گئیں
گل سے وابستہ کہانی جو سنانے لگ گئیں
کچھ تو جذبوں کی روانی میں بلا کا جوش تھا
کچھ ہوائیں بھی اثر اپنا دکھانے لگ گئیں
ہم نے عجلت میں نہیں پوچھا گلوں کا ماجرا
روٹھ کر سب تتلیاں گلشن سے جانے لگ گئیں
ہم وفا کے راز کو رکھتے چھپا کے کس طرح
دل تو تھا خاموش پر آنکھیں بتانے لگ گئیں
رسم چاہت پر پڑی کچھ جدتوں کی دھول تھی
جس کو پریاں جھیل سے آ کے اٹھانے لگ گئیں
جب بھی بسمل کو لگا مشکل وفا کا راستہ
جھٹ چھٹا کر مشکلیں آنکھیں بچھانے لگ گئیں

عبدالوحید بسمل/ایبٹ آباد

چیختے چلاتے ہوئے سناٹوں
بین کرتی ہوئی تنہائیوں
نوحے پڑھتی اداس شاموں
اور ماتم کناں آرزوؤں کے درمیان
خامشی کا صرف ایک لمحہ
بھی گر میسر ہو تو
گوشہ زیست میں سہی
بے خواب آنکھوں کو
ذرا سی نیند میسر آ جائے
دل بہل جانے کا امکاں ہو جائے

ڈاکٹر سائرہ بتول/اسلام آباد

تم نے مجھے ستا لیا اتنا کہ دل کی بس
وہ رنج میں نے پا لیا اتنا کہ دل کی بس
تم نے کہا تھا میں تمہیں دل سے قبول ہوں
پھر دل سے دل جدا کیا کہتے ہو دل کی بس
آتے ہیں مجھکو غیب سے رکھے ہوئے خیال
وہ پڑھ کے مسکراتے ہیں کہتے ہیں دل کی بس
وہ کہتے ہیں کے ہونٹ کا تِل ہے بہت کمال
اور پھر ادائے یار پہ اُف میرے دل کی بس
اب تم براجمان ہو میرے دماغ پر
پھر دل نے مجھ سے کہہ دیا کہ میرے دل کی بس

فائزہ صابری نوا

شبِ فراق میں پُردرد خواب دیکھا ہے
کہ اپنے پیار کا دریا سراب دیکھا ہے
تمہاری آنکھ میں دیکھی ہے موتیوں کی لڑی
تمہارے چہرے کو بکھرا گلاب دیکھا ہے
برستی آگ ہے، چاروں طرف ہے آہ فغاں
تمہارے بعد جو شہرِ خراب دیکھا ہے
طویل غم، شبِ تنہائی اور تاریکی
کتابِ زیست کا جو انتساب دیکھا ہے
صبا کے دوش پہ خوشبو کا پیرہن اوڑھے
گزرتی تتلیوں پر بھی عذاب دیکھا ہے
شفق کے چہرے پہ بکھرے ہوئے ہیں ہجر کے داغ
ہر ایک رُت کا پریشاں شباب دیکھا ہے

عامر بن علی/جاپان

فراق

دھڑکنوں میں ہلچل ہے
آنسوؤں کی جل تھل ہے
شعلہ بار سانسیں ہیں
بے قراری پل پل ہے
ذہن یوں لگے جیسے
اک غموں کی دلدل ہے

عامر بن علی/جاپان

قرآن

تو نے قرآن کی پوچھی ہے حقیقت مجھ سے
حق ترے دل کو کرے لوح و قلم کا ہمراز
سینہ روشن ہو تو انکار کی اک شاہ کلید
ہو نہ روشن تو فقط قصہء محمود و ایاز
اک نگاہ غلط انداز تو انکار سجود
ایک احساس ندامت تو جنوں کا آغاز
اس کی طاعت میں بسر ہو تو بہت روز ِچند
اس کے انکار میں بیتے تو عبث عمر دراز
جلوۂ کارگہء کن کی حقیقت کا ظہور
اپنے بندوں سے مخاطب ہے جہاں بندہ نواز
ہر مرض دل کا شفایاب ہو ایسا اکسیر
دل جسے سن کے لرز جائیں وہ محکم انداز
جیسے سمٹا ہوا کوزے میں سمندر کا وجود
جیسے پھیلا ہوا اوراک پہ دریائے گداز
ایسی تفصیل کہ تفصیل بھی شرمندہ ہو
ایسا ایجاز کہ ایجاز کہیں یا "اعجاز"
جس کی ہیبت سے جھکیں دشت و جبل ارض و سما
جس کی تاثیر کبوتر کو بنائے شہباز
جس کی تنویر سے دنیائے خرد ہو روشن
جس کی تعلیم سکھاتی ہے جنوں کیا انداز
یعنی فرمان خدا، یعنی حرا کی قندیل
یعنی قرآن مبیں، یعنی کتاب ممتاز

سرفراز بزمی/سوائی مادھو پور راجستھان

اکبر معصوم کی کلیات - گُلِ معانی

نوید مرزا/لاہور

ذرا یہ شاعری بھی پڑھ کے دیکھو
یہ اک مردے کی زندہ داستاں ہے

ایسا مردہ تھا میں کہ جینے کے
خوف میں مبتلا رہا ہوں

معروف شاعر اکبر معصوم کے ان شعروں نے نہ صرف مجھے پوری طرح ہلا کے رکھ دیا بلکہ اندر ہی اندر گرنے والے آنسوؤں نے تو جیسے رگ و پے کو کاٹ کر رکھ دیا ہے۔ اپنے نام ہی کی طرح معصوم اس بے مثال شاعر نے ذات میں کتنے کرب سمیٹ رکھے تھے، یہ وہی جانتا ہے۔ اکبر معصوم ایک ایسی شخصیت تھے جنہوں نے عمر کا ایک طویل حصہ پیچیدہ امراض میں گزار دیا، لیکن حوصلے اور ہمت سے اپنے حصے کی سانسیں اس فانی دنیا میں بسر کرتے رہے اور بالآخر اپنے رب کے حضور پیش ہو گئے۔ وہ ایک منفرد لہجے کے شاعر تھے، جن کو اپنے فن پر دسترس حاصل تھی۔ بعض اوقات وہ لوگ جنہیں زندگی نے ہر طرح کی سہولت دی ہوتی ہے، شاعری میں مایوسی کی باتیں کرتے ہیں لیکن ہمارے یہ شاعر تو بہت سے مسائل کا شکار تھے۔ انہوں نے اپنے اندر کے خلا کو پُر کرنے کی بے پناہ کوشش کی ہوگی تاہم پھر بھی ایسے شعر ان کے کلام میں در آئے جو ان کے اندر کے کرب اور کسی حد تک مایوسی کو ظاہر کرتے ہیں ان اشعار کی گہرائی میں اُتریں تو آپ بھی تڑپ اُٹھیں گے کہ کیسی کیسی اذیتوں کو شاعری میں تحریر کیا گیا ہے۔ تاہم وہ ایک باہمت انسان تھے۔ چند شعر دیکھیں:

جائے معصوم تو جائے بھی کہاں
یہ جو اندر کی بیابانی ہے

....

ہوں شہر کا باشندہ نہ جنگل کا ہوں باسی
رہتا ہوں وہاں میں جہاں رہتی ہے اُداسی

....

دھیرے دھیرے کھیل گیا میں اپنے سارے رنگ
مایا سب کچھ جیت گئی میں مٹی ہار گیا

....

کھل جائیں گی شہر کی آنکھیں
بولے گی یہ لاش کسی دن

....

کون چبائے اتنا کانچ
اتنا وقت گزارے کون

....

اس میں مرنے کی سہولت ہے بہت
زندگی میں یہی آسانی ہے

اکبر معصوم کی وفات کے بعد ان کا کل کلام ''گُلِ معانی'' کے نام سے رنگ ادب پبلی کیشنز نے شائع کیا ہے جو دو اردو اور ایک پنجابی شعری مجموعے پر مشتمل ہے۔ وہ اردو اور پنجابی دونوں زبانوں میں سہولت سے شعر کہتے رہے ہیں۔ اکبر معصوم کی انفرادیت، شعری اظہار اور زبان و بیان کی خوبصورتی اُنہیں ایک منفرد مقام عطا کرتی ہے۔ تاہم مجھے وہ بنیادی طور پر اردو شاعر کے روپ میں زیادہ بہتر نظر آئے ہیں۔ انہوں نے اپنے بھرپور تخلیقی شعری اظہار کے لیے غزل کو ہی منتخب کیا اور اس میدان میں کامیابی کے جھنڈے گاڑ دیے۔ بقول محمد سلیم الرحمٰن ''میں اکبر شاعری کا اس لیے اسیر نہیں ہوں کہ اس کا ذریعہ اظہار غزل ہے۔ یہ کام تو بہت سے لوگ بھی کر رہے ہیں۔ تاہم حقیقت یہ ہے کہ اکبر جتنی اچھی غزل کہنا ہی شاذ کی حدوں میں شامل ہے۔ تاہم اس استعجاب میں تنہا ہی نہیں ہوں بلکہ ایک بہت عمدہ شاعر جاوید شاہین کا بھی کچھ ایسا ہی موقف ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ اکبر کی غزلیں پڑھتے ہوئے کہنا پڑتا ہے'' ''کیا ٹیلنٹ ہے۔'' اکبر کی دوسری کتاب ''بے ساختہ'' حال ہی میں زیورِ طبع سے آراستہ ہوئی ہے۔ اس کی بہترین غزلیں ٹکسال کے نو دمیدہ سکوں کی مانند دمکتی ہیں، وہ بجائے خود معجز نمائی ہیں۔ استعجاب کا اظہار یہ ہیں۔ ایک ہلکی آنچ پر سلگتی اُداسی ہیں اندھیرے کے پیچھے ضیائے روشن اور ذات کا ابہام آمیز اظہار ہیں یا کہہ لیجیے کہ وہ سب کچھ ہیں جن کا ہم غزل سے انسلاک کر سکتے ہیں۔''

اکبر معصوم کی غزل میں موضوعات کی فراوانی کے ساتھ ساتھ بھرپور تخلیقی وفور، نت نئے خیالات، تجربات اور مشاہدات نظر آتے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ اس کی شاعری کا بہت سا حصہ اپنے ہی مسائل کے ارد گرد گھومتا ہے لیکن ان کے تمام شعر انفرادیت اور غزل میں مختلف ذائقے کے ترجمان ہیں۔ بقول شمیم حنفی:

''اکبر معصوم کی غزل اپنے ہم عصروں کی غزل سے الگ اپنا ایک منفرد جمالیاتی ذائقہ بھی رکھتی ہے۔ اِکا دُکا مماثلتوں کے ساتھ ساتھ ہمارے دور کی غزلیہ شاعری میں کم و بیش ہر غزل گو کے یہاں مضامین کی تکرار کا عنصر نمایاں ہے۔ اکبر معصوم کی شاعری میں بھی اس کی مثالیں ملتی ہیں مگر ہر فطری اور باکمال غزل گو کی طرح ان کا طرزِ اظہار ہمیشہ تکرار کے عنصر کو دبا دیتا ہے یا اس پر ایک پردہ سا ڈال دیتا ہے۔ اس کے علاوہ اس میں خود کار قسم کی غنائیت بھی ہوتی ہے۔ اکبر معصوم کی شاعری اس اُداسی اور غنائیت کے فیضان سے مالا مال ہے۔''

شمیم حنفی نے اکبر معصوم کی شاعری کا نہ صرف

بہترین تجزیہ کیا ہے بلکہ انہوں نے تخلیق کار کی ذات میں چھپے ہوئے درد، اُداسی اور دُکھ کی کیفیت کو بھی دریافت کیا ہے۔ اکبر معصوم کی شاعری میں نہ صرف اپنے دکھوں کی ترجمانی ہے بلکہ عصری مسائل اور زندگی کے بہت سے نشیب و فراز کی روداد بھی ملتی ہے۔ وہ ہجر و وصال اور محبتوں کو بھی نئے زاویوں سے دیکھنے کا قائل ہے۔ محبت کے وسیع موضوع پر اُس کے چند خوبصورت شعر ملاحظہ کریں:

وہ ایک بار نہیں ہے، ہزاروں بار ہے وہ
سو ہم اسی سے بچھڑ کر، اُسی سے ملتے ہیں

....

آج معصوم اُن سے کچھ نہ کہیں
آج اظہارِ مدعا ہو جائے
اُس کو میں بے وفا نہیں کہتا
ہے یہی اُسی سے انتقام مرا

....

کون تھا استقبال جو کرتا دل کے سونے ساحل پر
یاد خوشی سے آئی تیری اور بہت ناراض گئی

یہ تو چند محبت کے اشعار تھے، لیکن اکبر معصوم کی شاعری میں موضوعات کی رنگارنگی ہے اور جا بجا امکانات سے بھرے شعر موجود ہیں۔ آفاقی نوعیت کے ان اشعار میں نہ صرف قاری کو چونکا دینے کی صلاحیت موجود ہے بلکہ نقاد کو بھی سوچ کی نئی راہیں فراہم کرنے کی بھرپور قوت دکھائی دیتی ہے۔ جدید طرزِ احساس سے مزین یہ شاعری ہم پر حیرتوں کے کئی در وا کرتی ہے۔ بقول عباس عالم:

"اشعار، اشعار کے ظاہری معنی کھلتے ہیں تو ایسے پوشیدہ اسرار کے در کھلنے لگتے ہیں جو اردو غزل کو کسی اور دنیا میں لے جاتے محسوس ہوتے ہیں۔ لگتا ہے ان اشعار کا ایک باطن ہے جو ان اشعار کی نفسیات اور عمومی اچھی غزل کی نفسیات میں ایک جوہری فرق پیدا کر رہا ہے۔"

اکبر معصوم کی شاعری کا ایک اور وصف سادگی، بے ساختگی اور روانی ہے۔ وہ سہل ممتنع میں بڑی بات کہنے کا ہنر جانتے ہیں۔ اس حقیقت کی طرف احمد جاوید نے کیا خوب اشارہ فرمایا ہے۔ وہ کہتے ہیں "اگر کہا جائے کہ جدید شاعروں میں سہل ممتنع کی زیادہ مثالیں کہاں ہیں تو میں بلا تکلف اردو کے تمام جدید غزل گو شاعروں کے مقابلے میں اکبر معصوم کا نام سب سے پہلے پیش کروں گا کہ اُن کے ہاں اظہار میں سادگی، احساس میں شفافیت اور امیج وغیرہ میں ایک ذرا سی روشن سی پاکیزگی ہے ان سب نے مل کر اکبر معصوم کے شعر کو ایسا بنا دیا ہے کہ وہ محسوس ہوتا ہے کہ سہل ممتنع میں ہے۔ گویا اُن کے پیشتر اچھے اشعار سہل ممتنع کی بہترین مثالیں ہیں۔

اکبر معصوم کی کلیات "گُلِ معانی" میں ایک پنجابی مجموعہ بھی شامل ہے۔ انہوں نے پنجابی زبان میں بھی بڑے خوبصورت شعر کہے ہیں جو یقینی طور پر پنجابی ادب کا قیمتی سرمایہ ہیں۔ اکبر معصوم ایک بے مثال شاعر تھے جنہوں نے ادبی دنیا کو بہترین شاعری عطا کی اور اس جہانِ فانی سے رُخصت ہو گئے۔ اکبر معصوم 1960ء میں سانگھڑ میں پیدا ہوئے اور 2019ء میں سانگھڑ میں وفات پائی۔ اللہ پاک ان کی مغفرت فرمائیں۔ (آمین)

بقول اکبر معصوم:

ہم کو ایک زمانے تک
روئیں گے ویرانے تک

اکبر معصوم کو تادیر یاد رکھا جائے گا۔ دعائے مغفرت ہے۔ اللہ تعالیٰ انہیں جنت الفردوس میں اعلیٰ ترین مقام عطا فرمائیں۔ (آمین)

شمیم آزر/امریکا

معجزے ہوتے اور یہیں ہوتے
کاش تم صاحب یقیں ہوتے

اپنی قسمت تھی، ہم کہیں ہوتے
بے فلک ہوتے بے زمیں ہوتے

میرے رشتے مرے تعلق سب
یا تو ہوتے ہیں یا نہیں ہوتے

اک خطا دور کر گئی ورنہ
تیرے نزدیک ہی کہیں ہوتے

ہو جو سکتی منافقت آزر
ہم بھی شاہوں کے ہم نشیں ہوتے

....

رات اور دن میں کوئی لمحہ تو ایسا ہوتا
ہم نے کچھ دیر کو اپنے لیے سوچا ہوتا

ایک بھی شخص نہ تھا شہر میں ایسا جس پر
تری صورت تری آواز کا دھوکا ہوتا

بڑھ گیا اور بھی کچھ حبسِ دل و جاں اب کے
ابر اُٹھا تھا تو پھر ٹوٹ کے برسا ہوتا

بے وفائی کا تمہیں اس سے گلہ ہے لیکن
تم نے آزر کبھی خود کو بھی تو پرکھا ہوتا

افسانہ

پانچ سو کا نوٹ

رابنسن سیموئل گل

"حد ہوگئی، بھلا تمہیں کس نے کہا تھا کہ ابا جی کو پانچ سو کا نوٹ دے کر بازار بھیجو۔ اِس عمر میں تو بندہ ویسے ہی سٹھیا جاتا ہے۔ ابا جی کو تو اپنی ہوش نہیں اور تم نے انہیں پورے پانچ سو کا نوٹ ہی دے کر دکان پر بھیج دیا۔"

اپنے شوہر کو برہم ہوتا دیکھ کر بیگم آفتاب بھی تلخ آمیز لہجے میں بولیں، "میرے پاس وہی ایک نوٹ تھا جو آپ صبح دے کر گئے تھے، تو آخر مَیں کیا کرتی؟ ابا جی ہی گھر پر تھے تو مَیں نے اُن کو بھیج دیا۔ مجھے کیا پتا تھا کہ نقصان کرا آئیں گے۔"

"بچوں سے منگوا لیتی یا مجھے فون کر دیا ہوتا مَیں واپسی پر لیتا آتا۔"

"بچے سکول سے آ کر ٹیوشن پڑھنے جا چکے تھے اور ہاں آپ تو جیسے بڑے آرام سے میری بات سن لیتے اور خوشی سے سودا سلف لے آتے ہیں۔ آپ کو بھی دفتر سے واپسی پر کچھ لانے کا کہہ دوں تو کتنی باتیں سننا پڑتی ہیں۔"

"اوہو، تم خواہ مخواہ بات کا بتنگڑ بناتی جا رہی ہو، مَیں دفتر سے تھکا ہارا آیا ہوں اور تم نے آتے ہی یہ تماشا لگا دیا۔"

آفتاب صاحب کے لہجے میں اب مزید تلخی در آئی تھی کیوں کہ وہ دفتر سے آتے ہی منہ ہاتھ دھو کر گرم گرم چائے پینے کے عادی تھے۔ اب تو بیگم کا بھی پارہ چڑھ گیا۔

"میری ہر بات آپ کو تماشا ہی لگتی ہے۔ مَیں یہاں نوکر نہیں لگی ہوئی کہ سب کو کھلاؤں پلاؤں بھی اور یوں باتیں بھی سنوں۔ مَیں آپ ہی کے لیے فکرمند تھی، اِس لیے غلطی سے ابا جی کو بھیج دیا.... اور کیا وہ اپنے بڑے بیٹے کے ہاں خوش نہ تھے، میری ذمہ داریاں پہلے کیا کم تھیں جو آپ اُنہیں یہاں اٹھا لائے ہیں۔"

"مَیں اُنہیں اٹھا کر نہیں لایا، وہ چند دن کے لیے آئے ہیں، لوٹ جائیں گے۔"

"میرا نہیں خیال کہ اب وہ کبھی اپنی بڑی بہو کے ہاں لوٹیں گے، اُس نے بھی اپنا آپ دکھا دیا ہے اور اُنہیں بے عزت کر کے ہی نکالا ہوگا۔ ابا جی بلاوجہ یہاں ہمارے پاس نہیں آئے، کوئی نہ کوئی وجہ تو ضرور ہوئی ہوگی۔ آپ جانتے ہیں کہ ہمارا گھر پہلے ہی چھوٹا ہے، بچے بڑے ہو گئے ہیں اور ہر کوئی چاہتا ہے کہ اُس کا الگ کمرہ ہو۔"

اِسی دوران میں ابا جی پسینے میں شرابور گلا کھنکھارتے ہوئے گھر میں داخل ہوئے۔ بیگم آفتاب نے دھیمی آواز میں کہا، "لیں گھوم پھر آئے ہیں آپ کے ابا جی... اگر مَیں نے دکان سے کچھ لانے کو کہہ دیا تو بزرگوں نے پیسے ہی گما دیا۔ اب انسان اِن کو کیا کام دے؟ اِن کے یوں فارغ بیٹھے رہنے سے تو گزارا نہیں چلے گا، یہ خود بھی بیمار پڑ جائیں گے۔"

"اچھا ابھی خاموش ہو جاؤ!" آفتاب نے سرگوشی کے عالم میں اپنی بیوی کو ڈانٹا اور پھر ابا جی کی جانب دیکھتے ہوئے بولا، "السلام علیکم ابا جی!"

"وعلیکم السلام بیٹا، کیسے ہو تم؟"

"مَیں تو ٹھیک ہوں، آپ اپنا خیال رکھا کریں۔ یونہی اکیلے باہر نکل جاتے ہیں۔ کسی دن کھو نہ جائیے گا۔"

"نہیں بیٹا، مَیں بوڑھا ہوا ہوں مگر ذہنی طور پر تو ٹھیک ہوں۔ ہاں بس وہ پسینہ پونچھنے کے لیے کہیں جیب سے رومال نکالا تھا تو لگتا ہے پیسے جیب سے گر گئے۔"

"ابا جی، ویسے حد ہوگئی ہے بے پروائی کی، بندہ آپ کو کام کیا کہے۔ آپ کو اندازہ نہیں کہ آج کے دور میں کس قدر مہنگائی ہے اور انسان ایک ایک پائی کے لیے خوب محنت کرتا اور مشکل سے اِتنا کماتا ہے کہ روز کا گزر بسر ہو سکے۔"

ابا جی کی آنکھیں پُرنم تھیں کیوں کہ وہ اِس سے پہلے اپنی بہو کے ہاتھوں بھی خجالت اٹھا چکے تھے اور اِسی وجہ سے گرمی اور تھکن کے باوجود دوبارہ گھر سے نکل کھڑے ہوئے کہ اُس نوٹ کی تلاش کر سکیں جو راستے میں کہیں کھو گیا تھا۔ وہ پسینے میں شرابور راہ چلتے لوگوں سے پوچھتے رہے تھے کہ بیٹا یہاں کہیں پیسے تو گرے ہوئے نہیں ملے۔ ہر کوئی بابا جی کو سٹھیایا ہوا سمجھ کر ہنس دیا یا جس نے سنجیدگی سے لیا تو اُس نے بھی سمجھایا کہ بابا جی یہاں تو لوگ جیبیں کاٹ کے پیسے لے جاتے ہیں تو گرے ہوئے کون چھوڑتا ہے؟ خواہ مخواہ گرمی میں پریشان نہ ہوں، گھر کو جائیں جو ہونا تھا سو ہو گیا۔

ابا جی گرمی میں ہی گھر سے باہر کچھ وقت گزار کر اِس خیال سے لوٹے تھے کہ بیٹا دفتر سے آ چکا ہوگا تو اِس طرح اکیلے میں بہو کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا اور وہ اپنی بیوی کو بھی ڈانٹ پلا دے گا۔ مگر وہ گھر پہنچے تو اُن کے بیٹے نے اُن کی توقع کے برعکس اپنی بیوی کا ساتھ دیتے ہوئے اُن ہی کو جلی کٹی سنانا شروع کر دیں۔ اب اُن کے پاس ضبط کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا تاہم اُن کے چہرے پر پسینے کے قطرے مزید نمایاں ہو گئے تھے، نہ جانے موسم کا اثر تھا یا پھر یہ اُس ذلت اور شرمندگی کے باعث تھا جس کا انہیں دوسری بار سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ بہو کی تو خیر تھی مگر بیٹے کے اِس روّیے نے اُن کی آنکھوں کو پُرنم کر دیا۔ پسینے اور آنسوؤں کے قطرے اُن کے جھریوں زدہ چہرے پر بہتے ہوئے یوں گڈمڈ ہوئے کہ اُن کا اپنا بیٹا بھی اُن کے زخمی دل سے پھوٹنے والے اُن آنسوؤں کو دیکھ نہ سکا۔ اُنہوں نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے ایک بار پھر رومال نکالا اور اِس بار پسینے کے ساتھ ساتھ آنسو بھی پونچھ ڈالے کہ اب اِن آنسوؤں کو پونچھنے والا کوئی نہ تھا۔

ابھی چند ماہ ہی تو ہوئے تھے جب اُن کی شریکِ حیات کینسر کے موذی مرض سے جنگ لڑتے لڑتے زندگی کی بازی ہار گئی تھی۔ شاید اُس سے اپنے شوہر کے آنسو دیکھے نہیں جاتے تھے۔ دونوں مل کر آنسو بہاتے اور پھر ایک دوسرے کو تسلی دیتے ہوئے

آنسو پونچھ بھی دیتے تھے۔ صرف تین ماہ وہ اِس کرب سے دوچار رہی مگر اِس عرصے میں اُن کی تمام تر جمع پونجی مرض کی تشخیص پر صرف ہو گئی اور جب تشخیص ہوئی تو گنتی کے چند دن بچے یا شاید اُس کی شریکِ حیات نے جو عمر بھر خوشی کے ساتھ اُس کا ہر کام کرتی رہی، ہر بوجھ دونوں مل کر اٹھاتے رہے، اب یہی مناسب جانا کہ اپنے بوڑھے شوہر کے ناتواں کندھوں پر مزید بوجھ نہ بنے اور آخر کار اُس نے ہتھیار ڈال دیے۔

ابا جی نے پہلے پہل تو ہمت کی تھی مگر اب وہ غم سے نڈھال ہوتے چلے جا رہے تھے اور مایوسی و نا اُمیدی کے اندھیرے روز بروز گہرے ہوتے جا رہے تھے۔ آج کے اِس واقعے نے تو اُنہیں بُری طرح گھائل کر کے رکھ دیا تھا۔ اُس لمحے وہ بالکل خاموش ہو گئے اور بس اُن کا بیٹا آفتاب ہی بنا سوچے سمجھے بولتا چلا گیا۔

آفتاب منہ ہاتھ دھو کر ٹی وی کے سامنے آ کر بیٹھا تو ایسا پُرسکون تھا جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ حسبِ معمول بیگم چائے لے کر آئی۔ خبریں سنتے ہوئے چائے کی ایک چُسکی لگائی تو ساتھ ہی پیالی ایک طرف رکھتے ہوئے بولا، ”بیگم تمہیں پتا تو ہے کہ مَیں پھیکی چائے نہیں پیتا۔“

”آج گزارا کر لیں، مَیں اِسی لیے ساتھ یہ میٹھے بسکٹ لے آئی ہوں۔ آپ ہی کی وجہ سے تو ابا جی کو چینی لینے بھیجا تھا اور پھر یہ سارا ڈراما ہو گیا، چینی بھی نہیں آئی اور پانچ سو روپے کا نقصان بھی ہو گیا۔“

”اوہ اچھا“، آفتاب نے قدرے توقف سے گہری آہ بھرتے ہوئے یہ دو الفاظ کہے تھے۔ گویا وہ کسی گہری سوچ میں ڈوب گیا ہو۔ اُس نے خاموشی سے چائے پی، بے دھیانی سے ٹی وی دیکھا اور پھر کچھ لمحوں کے لیے تنہائی میں چپ سادھ لی۔ وہ یادوں کے جھروکوں سے ماضی میں جھانکنے لگا۔

اُس کے ابا جی تو بہت ہی معمولی درجے کے سرکاری ملازم تھے۔ اُن کی ذمہ داری میں سرکاری پانی کی بروقت ترسیل شامل تھی۔ یہ چوبیس گھنٹے کی نوکری تو نہ تھی مگر ذمہ داری والا کام تھا کیوں کہ مختلف علاقوں کے لیے مختلف اوقات میں واٹر سپلائی کھولی اور بند کی جاتی تھی۔ عمر بھر اُنہوں نے شاید کبھی نیند بھی پوری نہ کی تھی۔ اُن کی تنخواہ اِتنی کم تھی کہ پانچ بچوں کا بوجھا کیلیے اٹھانا ممکن نہ تھا۔ چنانچہ وہ باقی دن میں محنت مزدوری کرتے اور اِس طرح دیہاڑی لگا لیتے تھے۔ روزمرہ کا کھانا پینا اُسی روزانہ کی اجرت سے چلتا تھا۔ تنخواہ تو مکان کے کرائے، بلوں اور بچوں کی فیسوں وغیرہ میں نکل جاتی تھی۔ اُن کی کوشش سے سب بچوں نے کم از کم انٹرمیڈیٹ تک ضرور تعلیم حاصل کر لی تھی۔ اُن کا خواب تو اُنہیں زیادہ سے زیادہ پڑھانا تھا مگر معاشی حالات اجازت نہ دیتے تھے۔

”آفتاب!...او بیٹا آفتاب!“

اپنی امی کی آواز آفتاب کے کان میں پڑی اور وہ باورچی خانے کی جانب دوڑا۔

”جی امی جان!“

”بیٹا، جاؤ اپنے ابا جی سے پیسے لے کر دکان سے چینی لے آؤ۔ تمہارے ابا جی نے چائے پینی ہے اور وہ میٹھی ہی پسند کرتے ہیں۔“

ابا جی ابھی ابھی گھر لوٹے تھے۔ اُس روز وہ دن بھر مزدوری کر کے پانچ سو روپیہ دیہاڑی لائے تھے۔ ابا جی کے پاس وہی ایک نوٹ تھا جو اُس زمانے میں واقعی سب سے بڑا نوٹ ہوا کرتا تھا۔

امی جان نے منع کیا کہ اِتنا بڑا نوٹ بچہ کہیں گما نہ دے۔

”نہیں، نہیں بیٹا آفتاب بھی اب بڑے بھائیوں کی طرح سمجھ دار ہو گیا ہے۔ یہ اِسی طرح تو سیکھے گا۔“

دس سالہ آفتاب نے اپنی نیکر کی جیب میں وہ نوٹ ڈالا وہ خوش تھا کہ اُس کے باپ نے اُس پر اعتماد کیا ہے۔ اُس نے دکان کی جانب دوڑ لگا دی۔ اِسی اثنا میں اُسے ٹھوکر لگی اور گرنے کے باعث اُس کا گھٹنا چھِل گیا۔ افسوس کہ وہ زخمی گھٹنے کے ساتھ دکان پر پہنچا تو علم ہوا کہ نوٹ کہیں راستے میں ہی گر گیا ہے شاید جہاں آفتاب خود گرا تھا۔ اُس نے راستے بھر میں تلاش کی لیکن آخر کار خالی ہاتھ گھر لوٹا۔ اُس کی امی جان نے خوب ڈانٹا جب کہ ابا جی نے بس یہی کہا،

”کوئی بات نہیں بیٹا، نقصان تو ہو ہی جاتے ہیں۔ پیسے پھر آ جائیں گے۔ شکر ہے کہ تجھے زیادہ چوٹ نہیں لگی۔ اپنا خیال رکھا کر۔“

اور پھر اُس روز اُنہوں نے مسکراتے ہوئے پھیکی چائے ہی پی لی تھی۔

آج کئی برسوں بعد اُس سارے واقعے کو یاد کر کے آفتاب کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اُس کے گھٹنے کا زخم تو چند دنوں میں بھر گیا تھا لیکن آج اُس نے محض پانچ سو روپے کے نوٹ کی خاطر اپنے باپ کے دل اور روح پر جو زخم لگائے تھے، کیا وہ کبھی بھر سکیں گے۔ وہ خوب جی بھر کر رویا۔ اُس میں ہمت نہ تھی کہ اپنے باپ کا سامنا کر سکے۔ اُنہوں نے زندگی بھر کبھی دوبارہ اُس پانچ سو کا ذکر تک نہ کیا تھا...اور آج بھی اُنہیں وہ واقعہ قطعاً یاد نہ تھا ورنہ وہ اُس کا حوالہ دے دیتے۔ انہوں نے تو بس چپ سادھ لی تھی۔

بوجھل قدموں کے ساتھ آفتاب اُس کمرے کی جانب بڑھا جہاں آج کل ابا جی ٹھہرے ہوئے تھے۔ کھڑکی کا پردہ ہٹا ہوا تھا۔ باہر ہر سُو اندھیرا پھیل چکا تھا۔ شام سے لے کر اب اندھیرا پھیلنے تک ابا جی کمرے سے باہر نہیں نکلے تھے۔

آفتاب نے کمرے کا بلب روشن کیا تو ابا جی نیم دراز حالت میں بے سدھ پڑے تھے۔ باہر کا اندھیرا اُن کے اندر بھی داخل ہو چکا تھا۔ آفتاب سکتے میں آ چکا تھا۔ اُس نے ابا جی کو جھنجھوڑا تو اُن کا سر ایک جانب ڈھلک گیا۔ اُن کے سینے پر ایک کاغذ پڑا تھا جس پر لرزتے ہاتھوں سے اُنہوں نے کوئی حساب کتاب کیا ہوا تھا۔ کچھ ہندسوں کو کاٹ کاٹ کر دوبارہ سے جمع تفریق کی تھی۔

آفتاب نے غور سے پڑھا تو ابا جی نے ماہانہ پینشن مبلغ ستاسی سو روپے میں سے کچھ دوائیوں اور ذاتی اخراجات کو کم کر کے پانچ سو روپے کا حساب کتاب کیا تھا تا کہ آنے والے مہینے کی پینشن میں سے وہ کھویا ہوا پانچ سو کا نوٹ آفتاب کو واپس لوٹا سکیں۔

خواب نگر کی گڑیا

بابرہ امین

گڈو خواب میں بڑبڑاتے ہوئے: ماں مجھے گڑیا لے دو ناں !ابا سے کہو کام سے واپسی پر میرے لیے پیاری سی گڑیا لیتے آئیں۔ ہوا و نہ ہوں کی آوازیں نکالتے ہوئے گڈو نجانے کب سے خواب دیکھ رہی تھی۔

اچانک ایک بھاری آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی: گڈو اُٹھ جاؤ کب تک سوتی رہوگی؟

وہ ایک دم سے گھبرا کر اٹھی اور بولی " :جی ماں جی !آنکھیں کھولیں تو پتہ چلا کہ سامنے اس کی ماں نہیں حنا باجی کھڑی ہیں۔ ماں تو اسے گڑیا دلانے کے بہانے یہاں چھوڑ گئی تھی۔

حنا باجی ایک دفعہ پھر بولیں: گڈ گڈو !اٹھ جاؤ چھ بج گئے ہیں کب تک سوتی رہوگی؟ یہ لو چھوٹے صاحب کو پکڑو میں ذرا نور کو سکول کے لیے تیار کر دوں۔ گڈو فوراً اُٹھی اور چھوٹے صاحب کو گود میں لے لیا اور ادھ کھلی آنکھوں سے باجی کے پیچھے چلتی ہوئی نور کے کمرے تک پہنچی۔

گیارہ سال کی تھی گڈو نیند سے بوجھل آنکھوں کے ساتھ نور کا کمرہ پہلی بار دیکھ رہی تھی۔ کمرہ بے شمار کھلونوں سے بھرا ہوا تھا۔ ان میں سے ایک خوب صورت ڈول ہاؤس (گڑیا گھر) جو نور کے بیڈ کی بائیں جانب رکھا ہوا تھا، اس میں ہر سائز کی گڑیا موجود تھی۔ گڈو نے ان میں سے گلابی رنگ کے کپڑوں والی گڑیا کو پکڑنے کے لیے ہاتھ بڑھایا تو نور نے اُسے زور سے دھکا دیا اور غصے سے بولی: یہ گڑیا میری ہے۔ آئندہ میری چیزوں کو ہاتھ مت لگانا۔

باجی نے نور سے کہا " :بری بات !آؤ جلدی سے تیار ہو جاؤ۔ نور تیار ہو گئی تو باجی نے گڈو سے کہا: "ڈرائیور کے ساتھ جا کر نور کو سکول چھوڑ آؤ اور ہاں !نور کا بستہ خود اُٹھانا۔ گڈو پہلے ہی گھبرائی ہوئی تھی، اس نے چھوٹے صاحب کو باجی کو پکڑایا اور نور کا بیگ اٹھا کر گاڑی کی طرف چل دی۔

سکول گھر سے تھوڑے فاصلے پر تھا۔ گاڑی سکول کے سامنے رکی تو گڈو نے نور کا بیگ اٹھایا اور اس کو گیٹ تک چھوڑ کر آئی۔ نیند ابھی بھی گڈو کی آنکھوں میں تھی۔ واپسی پر وہ ان جانے راستوں کو تکتی ہوئی اپنے سکول کے بارے میں سوچنے لگی۔

اس کی ماں کی آواز میں اس کے کانوں سے ٹکرانے لگیں: گڈو !اٹھ جاؤ سکول جاتا ہے۔ جلدی کرو ورنہ دیر ہو جائے گی۔ تمھارے ابا تمھیں کام پر جاتے ہوئے سکول چھوڑ دیں گے۔ "ماں کی آواز پھر سے اس کے کانوں سے ٹکرانے لگی: گڈو !ناشتہ کرلو۔ گڈو " :نہیں اماں !دیر ہو جائے گی۔"

مجھے پتا تھا تم ایسے ہی کہو گی۔ میں نے تمھارے ٹفن میں آلو کا پراٹھا رکھ دیا ہے۔ بریک میں اسے کھا لینا۔ اچھا اماں۔ اماں کے آلو کے پراٹھوں کا ذائقہ اس کی زبان پر ابھی بھی رکھا تھا جو اس کی بھوک کو بڑھا رہا تھا۔

لاشعور میں چھپی آواز میں بار بار اس کو اماں ابا کی یاد دلا رہی تھیں۔ کبھی سکول کی سہیلیوں کے بارے میں سوچتی کہ وہ کون سا سبق پڑھ رہی ہوں گی۔ یہ سب باتیں اُسے اداس کر رہی تھیں۔ گھر پہنچی تو اداسی اس کے چہرے پر عیاں تھی۔ گھر سے آئے دوسرا دن تھا۔ وہ اپنے ماں باپ کو بے چینی سے یاد کرنے لگی۔ بے شمار سوالات اس کے ننھے سے دماغ میں ہل چل مچا رہے تھے کہ ابا کے بیمار ہونے پر اماں مجھے یہاں کیوں چھوڑ گئیں؟ مجھے نہیں چاہیے گڑیا مجھے بس اماں ابا کے پاس جانا ہے۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے کہ تھمنے کا نام نہ لے رہے تھے۔

وہ بے چینی سے اپنی ماں کو پکارنے لگی: ماں ماں

پہلی رات بھی تو گڈو نے ڈرتے ہوئے گزاری تھی۔ کہاں ماں کے ساتھ سوتے ہوئے وہ ساری دنیا سے بیگانہ ہو جاتی تھی۔ وہ ماں کدھر گئی جو گڈو کے کروٹ لینے پہ اُٹھ جاتی تھی؟ بند لائیٹ میں کمرے کی ہر بے جان چیز جان دار بن کر اسے ایسے خوف زدہ کرنے لگیں جیسے وہ بھوت ہوں۔ گرمی کے موسم میں اس نے اپنا منہ بستر کی چادر سے ڈھانپ لیا۔ وہ پسینے سے شرابور ہو گئی۔ اس کی چیخیں اپنے اندر ہی کہیں دب کر رہ گئیں۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ ابھی اپنی اماں کے پاس چلی جائے اور اس سے لپٹ جائے۔ پر وہ ڈر کی وجہ سے ساکت ہو گئی تھی۔ روتے روتے پھر نجانے کب اس کی آنکھ لگی۔

صبح باجی کی آواز نے ہی اُسے بیدار کیا۔ گڈو اٹھتے ہی اپنی اماں کو یاد کر کے رونے لگی اور ماں کو پکارنے لگی۔ باجی نے اسے چپ کروانے کے لیے اس کی ماں سے بات کروانے کا وعدہ کیا۔ اس پر وہ خاموش تو ہو گئی مگر اس کی ہچکی بندھ گئی۔ کچن والی اماں نے اسے گلے سے لگایا اور ناشتہ دیا، پر ایک آدھ نوالہ ہی اس کے حلق سے نیچے اترا۔ ننھی سی گڑیا کی آنکھوں سے آنسو بہتے جا رہے تھے۔ پورا دن گزر گیا، باجی نے اس کی بات اماں سے نہیں کروائی۔ رات کو نور کے آباد

بیٹی سے لوٹے تو گھر میں اس بچی کو کام کرتا دیکھ کر پریشان ہو گئے۔ صبح سویرے حنا نے گڈو کو جگا دیا کہ چھوٹے صاحب کو پکڑ لے۔ نور تیار ہو گئی تو حنا نے گڈو سے کہا کہ ساتھ جا کر نور کو سکول چھوڑ آئے۔ نور ضد کرنے لگی کہ آج وہ اپنے بابا کے ساتھ سکول جائے گی۔ بابا اپنی بیٹی کی بات کیسے نہ مانتے وہ تو ان کی لاڈلی بیٹی تھی۔ نور نے گڈو کو کہا کہ میرا بستہ گاڑی میں رکھو، گڈو نے نور کا بستہ اٹھا کر گاڑی میں رکھ دیا۔

نور کے بابا کو یہ سب برا لگ رہا تھا کہ نور نے چھوٹی بچی کو اپنا بستہ اٹھانے کو کیوں کہا؟ نور کے بابا نور کو سکول چھوڑ کر واپس آئے تو انھوں نے اپنی بیوی کو کہا: اس بچی کو فوراً اس کے گھر بھیج دو ہم اتنی چھوٹی بچی سے گھر کا کام نہیں کرا سکتے۔ حنا نے صبح سویرے گڈو کی اماں کو فون کیا: صغراں آج میری طرف آؤ تم سے بہت ضروری بات کرنی ہے، آ جانا ضرور۔

صغراں نے کہا: جی باجی ٹھیک ہے میں دو پہر تک پہنچ جاؤں گی۔

صغراں کا دماغ وسوسوں سے بھر گیا۔ الٹے سیدھے خیال تو اس دن سے اس کے ساتھ تھے جس دن سے وہ گڈو کو کام پر چھوڑ کے آئی تھی۔ صغراں نے اپنے خاوند سے کہا: جلدی تیار ہو جاؤ گڈو کی باجی نے بلایا ہے۔

دونوں قصور سے لاہور جانے والی بس میں بیٹھ گئے۔ ان کا سفر کوئی گھنٹے سوا گھنٹے کا تھا لیکن پریشانی میں طویل لگ رہا تھا۔ دونوں راستے میں ایک دوسرے کو کوستے جا رہے تھے۔ انھیں احساس ہو گیا تھا کہ انھوں نے اپنی معصوم بچی پر کس قدر ظلم کیا ہے۔ باجی نے گڈو کو بتایا کہ آج اس کی ماں آ رہی ہے۔ یہ سن کر گڈو خوش ہو گئی اور بے چینی سے اپنی ماں کا انتظار کرنے لگی جیسے چڑیا کے گھونسلے سے کوئی بچے نکال لے تو وہ تڑپتی گھونسلے کے ارد گرد چکر کاٹتی رہتی ہے۔

اسی طرح ماں کے انتظار میں گڈو کبھی گیٹ پر جاتی، کبھی کمرے کی طرف جاتی۔ کچن والی اماں نے اس کی پریشانی کو بھانپ لیا تھا۔ وہ گڈو کو تسلی دے رہی تھیں اور کہہ رہی تھیں فکر نہ کرو تمھاری اماں پہنچنے والی ہیں۔ اماں ابا کے پہنچتے ہی گڈو اپنی اماں کے ساتھ لپٹ گئی۔

ماں نے اسے اپنی گود میں لیا اور کہا: گڈو میں تمھارے بغیر نہیں رہ سکتی، میں تمھیں لینے آئی ہوں۔

ابا نے کہا: گڈو مجھے معاف کر دو۔

یہ سب دیکھ کر حنا نے صغراں سے کہا: اسے واپس لے جاؤ۔ ہم اتنی چھوٹی بچی سے کام نہیں کروا سکتے۔

اس نے کچھ پیسے گڈو کی ماں کو دیے اور اس سے کہا: وہ گڈو کو ضرور پڑھائے اور اس کی پڑھائی کے تمام اخراجات کی ذمہ داری میری ہو گی۔ اس عمر کے کچھ خواب ہوتے ان کو پورا ہونے دو اور صغراں اس کو کسی اور کی نہیں تمھاری زیادہ ضرورت ہے۔

صغراں نے باجی کا شکریہ ادا کیا۔ باجی نے ڈرائیور کو کہا: انھیں بس سٹینڈ تک چھوڑ آئے۔

گڈو کی آنسوؤں سے ٹمٹماتی آنکھیں باجی کو شکریہ کہہ رہی تھیں۔

خواب نہ چھینو

خواب نہ چھینو

ننھی سی آنکھوں کے خواب

خواب نگر کے خواب ہیں مہنگے نہ کوئی مول، نہ ان کا دام

پھولوں کے رنگ تتلی کے سنگ ڈھونڈنے نکلے، ہو گئی شام

ماں کی گود ہے جنت جیسے، پیار ہے اس کا میٹھا جام

خواب نگر کے خواب ہیں مہنگے، نہ کوئی مول، نہ ان کا دام

حسن عباسی/لاہور

یاد اذیت ناک بنا کر خوش ہوتا ہوں
جلتے دیے کو ہاتھ لگا کر خوش ہوتا ہوں
یوں تو پھول بھی رکھے ہوتے ہیں کمرے میں
لیکن میں تلوار اُٹھا کر خوش ہوتا ہوں
اپنے پیار کا عادی کر لیتا ہوں جس کو
اُس سے اپنا ہاتھ چھڑا کر خوش ہوتا ہوں
اُس کی بے بس آنکھیں جب بھی یاد آتی ہیں
میں چیزوں کو آگ لگا کر خوش ہوتا ہوں
وہ جو میرے سپنے دیکھنے لگ جاتی ہیں
اُن آنکھوں کی نیند اُڑا کر خوش ہوتا ہوں
جس کے دل میں کوئی درد نہیں ہوتا ہے
اُس کے دل میں درد جگا کر خوش ہوتا ہوں
خود کو زخمی کرتا ہوں تالاب کنارے
اور پانی میں خون ملا کر خوش ہوتا ہوں
سپنے مرتے ہیں تو دفنانے سے پہلے
اُن کے سرہانے ساز بجا کر خوش ہوتا ہوں

نستعلیق مطبوعات

اردو ادب کے فروغ کا معتبر نام

پاکستان کا وہ ادبی ادارہ جو اب تک مختلف موضوعات پہ چھ سو سے زائد کتب شائع کر چکا ہے

معیار، نفاست، اور اعتماد کی پہچان!

آپ بھی اپنی کتاب کی دیدہ زیب اشاعت کے لیے ہم سے رابطہ کریں۔ ہم فراہم کرتے ہیں

کتاب کی ترتیب و تزئین

طباعت و اشاعت کے جدید تقاضے

مارکیٹنگ اور تشہیر میں پیشہ ورانہ معاونت

نستعلیق مطبوعات

فیروز سینٹر، غزنی اسٹریٹ، اردو بازار، لاہور

0316-4195471، 0300-4489310

CS CamScanner

کیا ہوئے وہ سوداگر جو رونق بازار تھے

عامر بن علی/ جاپان

ہوانا میں ایک مشہور دوکان ہے جو صرف زپ مرمت کرتی ہے۔اب زپ کا اردو ترجمہ مجھے نہیں معلوم جس کے لئے پیشگی معذرت خواہ ہوں۔کیوبا کی فقط اس ایک دوکان کا ذکر ہی کیا، بے شمار ایسے کاروبار ہیں جو پرانی اشیاء کی مرمت میں مہارت رکھتے ہیں۔بالخصوص موٹر گاڑی کے مستری تو کمال کرتے ہیں، ستر سال پرانی گاڑیاں بھی یوں جگ مگ کرتی، چم چم چلی جا رہی ہیں کہ نئی نویلی دلہن کا روپ یاد آتا ہے۔ ہمارے بازاروں میں بے شمار ایسے کاروبار تھے جو ہماری آنکھوں کے سامنے شروع ہوئے، نقطہء عروج پر پہنچے اور پھر معدوم ہو گئے۔اب ویڈیو سنٹر کو ہی لے لیجئے، پاکستان پر ہی موقوف کیا، پوری دنیا میں شہر شہر، گاؤں گاؤں یہ فلموں کے کیسٹ کرائے پر فراہم کرتے تھے۔جیسے آج کل نیٹ فلیکس اور پرائم ویڈیو ہے، یہی کام مقامی طور پر گلی کی نکڑ پر واقع دوکان اور عالمی سطح پر بلاک بسٹر نامی کمپنی کی دوکانیں کیا کرتی تھیں۔ چہاردانگ عالم ایسی دوکانیں کھلی ہوئی تھیں۔گلی محلے کے یہ ویڈیو سنٹر وی سی آر بھی کرائے پر فراہم کیا کرتے تھے، رات بھر کرائے پر یہ بھجواتے ہوئے ساتھ چار، پانچ فلمی کیسٹ بھی دیا کرتے تھے۔دوست احباب پیسے جمع کر کے پارٹی کرتے اور فلمیں دیکھتے۔ہمارے سامنے یہ کاروبار معدوم ہو گیا۔ نیٹ فلیکس کے مالکان اپنی کمپنی بلاک بسٹر کو بیچنا چاہتے تھے، اب خود ہی یہ اس کا متبادل بن سامنے آ گئی ہے۔

گیت اور موسیقی بھی آڈیو کیسٹ پر سنی جاتی تھی اور یہ کیسٹ بیچنے والی دوکانیں میوزک سنٹر کہلاتی تھیں۔ویڈیو سنٹرز کے مقابلے میں میوزک سنٹرز کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ان میں سے کئی میوزک سنٹرز ماضی بعید میں گراموفون بھی بیچتے تھے، جسے ف عام میں توا کہا جاتا تھا۔آپ نے پنجابی محاورہ ں کا توا لگانا تو ضرور سنا ہو گا؟اس کا ماخذ یہ گراموفون ہی تھا، حیرت کی بات ہے کہ یہی محاورہ عالمی، سطح پر انگریزی میں بھی مستعمل ہے BROKEN RECO'RD جسے ہم توا کہتے تھے، انگریز لوگ اسے ریکارڈ کہتے ہیں۔اور ٹوٹے ہوئے، شکستہ ریکارڈ کی تعریف یہ ہے کہ وہ بار بار ایک ہی بات، گیت دہرائے جاتا ہے۔اب نہ ہی گراموفون رہے اور نہ ہی ان پر چلنے والے ریکارڈ، ان کی جگہ لینے والے میوزک سنٹر بھی معدوم ہو گئے جو پہلے کیسٹ اور پھر میوزک سی ڈی فروخت کیا کرتے تھے۔ویڈیو گیمز کی دوکانیں اب نظر نہیں آتیں۔ایک وقت تھا جب یہ ایک مقبول پیشہ ہوا کرتا تھا۔اب بچے زیادہ تر گھروں میں ہی کھیلتے ہیں۔کچھ خوشحالی کے سبب اور پھر ٹیکنالوجی کی جدت نے ویڈیو گیمز کو گھر میں کھیلی جانے والی تفریح میں تبدیلی کر دیا ہے اور گیمز سنٹر کہلانے والی دوکانیں بند ہو گئی ہیں۔

کاتب اور خوش نویس تو صدیوں کی تاریخ رکھتے تھے۔کون سا ایسا شہر تھا اس عالم رنگ و بو میں جہاں ان کا وجود نہیں تھا؟ والدین بچوں کو خوش خطی سکھانے کے لئے ان کے پاس بھیجا کرتے تھے۔ کمپیوٹر ایجاد ہوا تو گمان بھی نہ تھا کہ یہ کاتبوں کو بے روزگار کر دے گا۔ہمارے اساتذہ فرماتے تھے کہ شاعری کسی کاتب کے ہاتھ سے تحریر کردہ ہی اچھی لگتی ہے، مگر وہ عہد تمام ہوا۔کیا عزت و تکریم ہوا کرتی تھی ان کاتب حضرات کی؟ نئی نسلوں کو تو گمان بھی نہ ہو گا کہ کیسے ارب پتی پبلشرز اور نامور مصنفین ان خوش نویسوں کی خوشامد کیا کرتے تھے۔

یورپ اور دیگر مغربی ممالک میں ٹائپ رائٹر ہم سے بہت پہلے ہی ان خوش نویسوں کو بے روزگار کر چکا تھا۔ ہمارے ہاں ٹائپسٹ ایک الگ پیشہ اور بازار کی رونق ہوا کرتے تھے۔یہ بابو ٹائپ لوگ انگریزی کے ماہر شمار ہوتے تھے۔یہ لوگوں کو درخواستیں، خطوط اور دیگر دستاویزات ٹائپ کر کے دیتے اور اپنا روزگار کماتے تھے۔ہم نے اپنی آنکھوں سے ان کا عروج، زوال اور پھر خاتمہ دیکھا۔اب دنیا میں کوئی کمپنی بھی نیا ٹائپ رائٹر نہیں بناتی اور استعمال شدہ ٹائپ رائٹرز بھی میوزیم سے متعلقہ چیز بن کر رہ گئے ہیں۔ہمیں یاد دلاتے ہیں کہ یہ کمپیوٹر کتنے کاروبار کھا گیا ہے۔

یاد آتا ہے کہ بازاروں میں بہروپئے بھی ہوا کرتے تھے، وہ کسی بھی شعبے سے متعلق سنجیدہ شخص کا بہروپ بنا کر آتے، پھر اپنی حقیقت بیان کر کے انعام پانے کی درخواست اور امید رکھتے۔منو بھائی نے بہروپیے کے نام سے اس موضوع پر ایک افسانہ نما کالم لکھ چھوڑا ہے، جس میں اس طبقے کے معدوم ہونے کا سبب یہ لکھا ہے کہ ہر شعبے کی ٹاپ پوزیشن پر اب کوئی بہروپیا بیٹھا ہے، اس لئے یہ پیشہ ختم ہو گیا ہے۔

نئی فلم سینما میں نمائش کے لئے آنے سے پہلے پورے شہر میں ڈھنڈورا پٹتا تھا۔ساتھ سازندے بھی ہوا کرتے جو شہر بھر کا گشت کرتے، ان کے ساتھ ہاتھ سے بنے ہوئے فلم کے پوسٹر ہوتے تھے۔اب نہ وہ ڈھنڈورچی رہے اور نہ ہی مصور جو خوبصورت پوسٹر ہاتھ سے بناتے تھے۔زیادہ تر سینما مسمار کر دیئے گئے ہیں۔اب فلمیں بھی نہ ہونے کے برابر بنتی ہیں جس کی یہ نمائش کیا کرتے تھے۔

جتھے گئیاں بیڑیاں، اوتھے گئے ملاح

ٹیلی فون اتنا عام نہیں ہوا کرتا تھا۔امیر لوگوں کے گھروں میں ہی یہ سہولت ہوا کرتی تھی۔سرکاری ٹیلی فون ایکسچینج سے کال کرنے کی عوامی سہولت تھی۔ بازار میں البتہ جگہ جگہ پبلک کال آفس ہوا کرتے تھے۔یہاں سے ٹیلی فون کرنے کی سہولت تو ضرور تھی مگر یہ بہت مہنگے تھے۔اب تو ٹیلی فون کرنے کے بوتھ بھی ختم ہو گئے ہیں اور پی سی او بھی باقی نہیں رہے۔

مزاح نگاری ایک مشکل کام ہے۔ سنجیدہ نثر نگاری بلکہ شاعری سے بھی مشکل تر یہی وجہ ہے کہ ارض پاکستان نے نارمل ادیب تو سینکڑوں کی تعداد میں پیدا کیے ہیں مگر مزاح نگار انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں۔اس ضمن میں پطرس بخاری، کرنل محمد خان، ابن انشا، شفیق الرحمٰن، مشتاق احمد یوسفی اور عطاء الحق قاسمی کے علاوہ کوئی بڑا نام شاید ہی ذہن میں آتا ہو۔مگر اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ یہ راہ خارداراب اجڑ چکی ہے۔ کچھ پرعزم راہی اب بھی اس راہگور پر آبلہ پائی کا رسک لیتے دکھائی دیتے ہیں۔ ان میں ایک نام جناب ذوالفقار احمد چیمہ کا ہے۔جنہوں نے پولیس سروس آف پاکستان کے ایک فرض شناس اور نیک نام افسر کے طور پر اپنی پہچان بناتے ہوئے دوران سروس ہی اپنی ادیبانہ صلاحیتوں کا اظہار شروع کر دیا تھا۔ اپنی والدہ ماجدہ کی وفات پر لکھے گئے ان کے پہلے ہی کالم نے انہیں جید و ممتاز کالم نگاروں کی صف میں شامل کر دیا تھا۔ بقول چیمہ صاحب اُس کالم کے روز نامہ جنگ اور نوائے وقت میں ایک ساتھ شائع ہونے پر دونوں اخبارات کے مالکان میر شکیل الرحمٰن اور مجید نظامی صاحب نے فون کر کے انہیں اپنے اپنے اخبار میں مستقل کالم نگاری کی پیشکش کی تھی۔وہ بطور آئی جی ریٹائر ہونے کے بعد اب ماشاءاللہ تین کتابوں کے مصنف اور روز نامہ جنگ کے مستند و مسلسل کالم نگار ہیں۔

بحیثیت ایک نامور سول سرونٹ | میں کبھی اور لاجواب ادیب و کالم نگار میں اُن کی صلاحیتوں کا بہت بڑا مداح تھا اور ہوں اور میری خواہش اور کوشش تھی کہ زندگی میں کبھی ان سے ملاقات ہو جائے۔میری حالیہ پاکستان یاترا کے دوران اسلام آباد میں اکتوبر کی ایک نہائی صبح کو موبائل آن کیا تو میسنجر پر ایک میسج نظر نواز ہوا۔لکھا تھا

السلام علیکم

ڈاکٹر مہاتیر محمد سے ملاقات کے بارے میں آپکی تحریر پڑھی۔ بہت لطف آیا۔۔ڈاکٹر صاحب میری بھی انتہائی پسندیدہ شخصیات میں سے ہیں۔۔ اور آپ کی تحریر بھی بڑی دلکش ہے۔

آج کل کہاں ہوتے ہیں اور کیا کر رہے ہیں۔

دعا گو۔ذوالفقار چیمہ۔

ریٹائرڈ آئی جی پولیس

ایک بار پڑھ کر آنکھوں پر یقین نہ آیا تو دوسری اور تیسری بار پڑھنے پر احساس ہوا کہ یہ تو کنواں خود چل کر پیاسے کے پاس آ گیا ہے۔یہ میری فیس بک پر موجود ایک تحریر پر محترم چیمہ صاحب کے دل خوش کن ریمارکس تھے۔سرشاری جذبات میں اظہار تشکر کے ساتھ جب میں نے انہیں بتایا کہ اتفاقاً میں ان دنوں پاکستان میں ہوں اور اسلام آباد میں اپنی بیٹی کے ہاں قیام پذیر ہوں تو چیمہ صاحب کے اس انکشاف پر کہ ریٹائرمنٹ کے بعد انہوں نے بھی اپنا مسکن اسلام آباد کو بنا رکھا ہے صورتحال احمد مشتاق کے اس شعر جیسی ہو گئی

مل ہی جائے گا کبھی دل کو یقیں رہتا ہے
وہ اسی شہر کی گلیوں میں کہیں رہتا ہے

از راہ نوازش اُنہوں نے مجھے اگلے ہی روز اسلام آباد کلب میں دوپہر کے کھانے کی دعوت دے دی۔ ملاقات کے لیے وہ اپنے تین دوستوں کے ساتھ آئے۔ پہلے کلب کے دیوان خاص میں اور پھر ڈائننگ ہال میں ایک طویل تعارفی نشست رہی جس کے اختتام پر میں نے انہیں اپنی دو تصانیف۔۔ "میاں چنوں سے ملائیشیا تک "اور تجربات حوادث" پیش کیں اور انہوں نے اپنی ایک انگریزی اور ایک اُردو کتاب "پس پردہ "تحفتاً عنایت کی جس پر تبصرے کے لیے یہ تمہید طولانی باندھی گئی ہے۔

خوبصورت سرورق اور معیاری کاغذ پر چھپی طنز و مزاح نگاری پر مبنی یہ کتاب 207 صفحات پر مشتمل ہے جس کی اشاعت قلم فاؤنڈیشن انٹرنیشنل، لاہور کے توسط سے ہوئی ہے اور قیمت اس کی ہے 1500 روپے۔یہ چھوٹے بڑے 21 مضامین پر مشتمل ہے جو ذوالفقار احمد چیمہ صاحب کی شگفتہ قلمکاری کے مظہر ہیں۔کتاب ہذا میں قارئین کی سرشاری طبع کے لیے کیا کچھ ہے اس کا اندازہ درج ذیل انتساب سے بخوبی کیا جا سکتا ہے۔

دنیا بھر میں بسنے والے ان خواتین و حضرات کے نام جو اُردو زبان سے محبت کرتے ہیں، جو شگفتگی سے رغبت رکھتے ہیں، اور جو مسکراہٹ سے بغض نہیں رکھتے

خطبہ استقبالیہ "کے زیر عنوان اس کتاب کا پہلا مضمون اس تقریب کی دلچسپ روداد ہے جو اولڈ راویئنز ایسوسی ایشن، اسلام آباد چیپٹر کے زیر انتظام 2004 میں منعقد ہوئی۔ اس تقریب کے مہمان خصوصی نامور مزاح نگار مشتاق احمد یوسفی صاحب تھے۔جنہیں اس تقریب کی صدارت کے لیے مدعو کرنے کی غرض سے کراچی میں بذریعہ پولیس ڈھونڈنے کا احوال خاصا قہقہہ آور ہے۔خطبہ استقبالیہ پیش کرتے ہوئے چیمہ صاحب نے ایک جگہ اسلام آباد کو افسروں کا شہر قرار دیتے ہوئے اپنی سول سروس برادری کا خاکہ کچھ اس طرح اُڑایا ہے۔

محترم مشتاق احمد یوسفی صاحب اسلام آباد کی

ریتوں اور روایتوں سے یقیناً واقف ہوں گے۔ یہ افسروں کا شہر ہے۔ "افسریت کی اپنی ایک الگ دنیا ہے۔افسروں کی اسی برادری کے بارے میں کسی شاعر نے صحیح کہا ہے کہ باہر سے افسری کا، کیا جاہ وجلال ہے
بکری نے پہن رکھی چیتے کی کھال ہے

زیرِ بیان تقریب کی پوری ویڈیو ایک عرصہ قبل میری نظر سے گزری تھی۔اس لیے میرا یہاں یہ کہنا بنتا ہے کہ کاش مصنف نے اپنے خطبہ استقبالیہ کے ساتھ ساتھ خطبہ صدارت کو بھی اس مضمون کا حصہ بنایا ہوتا۔ اس میں جواب آں غزل کے طور پر یوسفی صاحب نے مزاح کی جو پھلجھڑیاں چھوڑی تھیں اُن سے اِس مضمون کی چکا چوند میں مزید اضافہ ہوسکتا تھا۔۔ خطبہ استقبالیہ میں دروغ برگردن راوی کی آڑ میں ظاہر کیے گئے اس خدشے کے جواب میں کہ یوسفی صاحب نے ایک سے زیادہ شادیاں کر رکھی ہیں، صدرِ محفل نے اس ایک فقرے سے محفل کو زعفران زار بنا دیا تھا۔

دوستو !میری ایک سے زیادہ شادیوں سے متعلق جو خدشہ ظاہر کیا گیا وہ حقیقت نہیں حسرت ہے۔

معززین علاقہ "کے عنوان تلے لکھے گئے آرٹیکل میں فاضل مصنف نے اپنے تجربے اور مشاہدے کی بناء پر دورِ حاضر میں ہر علاقے میں پائے جانے والے معززین کی اصلیت کو بڑی چابکدستی سے بے نقاب کیا ہے۔ مشتے نمونہ از خروارے کے طور پر ایک معزز قاری صاحب کی حقیقت نمائی علامہ اقبال کے ایک ترمیم شدہ مصرعے سے یوں کی گئی ہے قاری
نظر آتا ہے حقیقت میں ہے شیطان۔

کتاب کا تیسرا مضمون "عزت "کا عنوان لیے ہوئے ہے۔اسے جس ایک مصرع میں بیان کیا جا سکتا ہے وہ ہے بدنام جو ہوں گے تو کیا نام نہ ہوگا

اس آرٹیکل میں ان لوگوں پر طنز ہے جو ذلت و رسوائی کے کاموں کو بھی باعث عزت و اعزاز سمجھتے ہیں

مثال کے طور پر جب کوٹھے کی ایک ڈانسر سے پوچھا گیا کہ میڈم اب تو آپ کے ڈانس دیکھنے کے لیے لوگ دُور دُور سے آتے ہیں اور آپ چوٹی کی رقاصہ بن چکی ہیں تو بتائیں کہ آپ فلموں میں کب جلوہ گر ہو رہی ہیں؟ تو ڈانسر کا جواب تھا کہ "اس گند میں پڑنے کی کیا ضرورت ہے اللہ نے یہیں بڑی عزت دی ہوئی ہے۔

اور مصنف نے اپنے پولیس کلچر پر طنز کرتے ہوئے ایک پورا پیراگراف لکھا ہے جو اقتباس کے طور پر پیشِ خدمت ہے۔ایس ایچ او ادریس پہلوان اپنے کوارٹر میں بیٹھا بار بار پہلو بدل رہا تھا کہ اُس کا کار خاص جیدا حوالدار کمرے میں داخل "ہوا۔اس کے ہاتھ میں لفافہ دیکھ کر ادریس پہلوان کی آنکھوں میں چمک آ گئی ۔جیدے نے نوٹوں کا لفافہ ایس ایچ او کو دیتے ہوئے کہا۔ "جناب !مقتول کے والد نے کہا ہے کہ سارے رانگڑ پرچے میں ڈال دو پیسے جتنے مانگو گے دے دیں گے۔ "ادریس پہلوان نے پیسے گن کر واپس لفافے میں ڈالتے ہوئے کہا۔ "یااللہ !شکر ہے تیرا۔سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ پیسوں کا بندوبست کیسے ہوگا۔کیس آنے سے عزت رہ گئی ہے ورنہ پہلے کیا رہ جاتا۔ یار ا سوہیا !بڑی عزت رکھی آ جیدے نے تفصیل پوچھی تو ایس ایچ نے بتایا کہ ایس ایس پی صاحب کا بیٹا انگلینڈ میں پڑھتا ہے۔اس کی فیس بھیجنے کی کل آخری تاریخ ہے اور یہ کام صاحب نے میرے ذمے لگایا تھا۔ پیسوں کا بندوست نہ ہوتا تو صاحب کے سامنے کیا منہ لے کر جاتا۔

بڑی بے عزتی ہوتی۔شکر ہے اللہ نے عزت رکھ لی ہے۔

اس کتاب کا طویل ترین مضمون "تقریب رونمائی "ہے جو بیس صفحوں پر مشتمل ہے۔یہ روداد ہے ایک ایسی کتاب کے فنکشن کی جو ایک حاضر سروس ڈی آئی جی پولیس نے بطورِ خاص اس لیے لکھوائی کہ اُسے ایک کمشنر انکم ٹیکس کی شاعری کی کتاب کا فنکشن بہت پسند آیا تھا اور وہ چاہتا تھا کہ وہاں جس طرح کمشنر صاحب کی تعریف ہوئی تھی ویسی ہی وہ اپنی تعریف کسی ادبی تقریب میں سنے۔ڈی آئی جی صاحب کے نام پر چھپنے والی یہ کتاب کیسے لکھوائی گئی، اس کی تقریب رونمائی کے لیے ہال کی بکنگ کس نے کروائی، دعوتی کارڈ کیسے چھپے، ہال کی پانچ سو نشستیں بھرنے کے لیے سامعین کہاں کہاں سے لائے گئے، حاضرین کے لیے کھانے کی ذمہ داری کس کی تھی اور دورانِ تقریب کیسے کیسے واقعات رونما ہوئے، یہ سب کچھ جس دلچسپ انداز میں قلمبند کیا گیا ہے وہ مصنف کی بلند پروازِ تخیل کی ایک اچھوتی مثال ہے۔

ذہین و فطین مصنف نے اپنے آرٹیکلز میں مختلف پاکستانی روایتوں اور رواجوں پر ماہرانہ انداز سے نشتر زنی کی ہے۔مثلاً آج تو کر لیے ہی چکیں گے "میں عورت کے ضدی پن اور ہٹ دھرمی کو آشکار کیا گیا ہے۔"

کیس تو ٹریس ہے "میں پولیس کے مروجہ پیچیدہ اور ناقص نظامِ تفتیش کو نشانہ ءتضحیک بنایا گیا ہے۔

خون ہی سفید ہوگیا ہے "میں اس حقیقت پر خامہ فرسائی کی گئی ہے کہ سرکاری افسر جب کسی بااختیار پوسٹ پر ہوتا ہے "تو لوگ اُس کی چاپلوسی، مدح سرائی اور عملی خدمت کی انتہا کرتے دکھائی دیتے ہیں مگر جب اسے کسی کمزور جگہ پر تعینات کر دیا جاتا ہے تو پھر۔۔کس نمی پرسد کہ بھنا کیستی پیر صاحب کوہستانی" میں تو ہم پرستی کے موضوع پر قلمکاری کرتے ہوئے یہ بتایا گیا ہے کہ لوگ اپنے کیسے کیسے عجیب اور فضول مسائل لے کر پیروں فقیروں اور جوتشیوں کے ہاں حاضری دیتے ہیں۔

اس کتاب کا دلچسپ ترین مضمون ہے۔ "یہ کام پیجا سنبھال لے گا۔ "یہ داستان الم ہے ایک

پڑھے لکھے اور باکردار شخص کی جو حیثیت ایزدی سے ایم این اے منتخب ہو جاتا ہے۔ اپنی اس ٹرم میں اُسے اپنے ووٹروں کے ہاتھوں جس جس طرح ذلیل وخوار ہونا پڑا وہ سب کچھ مزاحیہ نثر نگاری کا اعلیٰ ترین نمونہ ہے۔ اس آرٹیکل میں درج ذیل دو درج ذیل دو فقرے تو حاصل کتاب ہیں۔

بیٹے کو کویت کی فلائٹ پر روانہ کر کے د، داتا دربار میں مانگی جانے والی باپ کی دُعا۔ "یا داتا! میرے بچے کو بھی پردیس میں ایسے سیٹ کر جس طرح تو خود لاہور میں سیٹ ہوا ہے۔

بھینس چوری ہو جانے پر تیلی برادری کے بزرگ اور ایم این اے کے درمیان مکالمہ۔

ایم این اے۔ دیکھیں آپ کو پتا ہے چوری چکاری کی وارداتیں عام ہیں، آپ کا اتنا مال تھا اس لیے آپ کو تو چاہیے تھا کہ اُن کی حفاظت کے لیے کوئی چوکیدار رکھتے یا کتا رکھتے۔ تیلی برادری کا بزرگ۔ چوہدری صاحب! ہم تو آپ کی رعایا ہیں، ہمارے چوکیدار بھی آپ اور کُتے بھی آپ۔ آپ ہی "ہمارا سب کچھ ہیں۔

کُتے کا لقب سُن کر چوہدری صاحب منہ لپیٹ کر نکل گئے اور آئندہ کئی دنوں تک اُن کے کانوں میں یہی فقرہ گونجتا رہا۔" "ہمارے چوکیدار بھی آپ اور ہمارے کُتے بھی آپ۔

یہ تو طے ہے کہ ذوالفقار احمد چیمہ صاحب کو اردو نثر نگاری پر مکمل عبور حاصل ہے۔ مروجہ اصطلاحیں، محاورے، اشعار، مصرع، تشبیہیں اور استعارے دوران تحریر ان کے سامنے ہاتھ باندھے کھڑے رہتے ہیں مگر انہوں نے جا بجا خود ساختہ اشعار اور ترمیم و تضمین کردہ اشعار دیگراں سے جس طرح اپنی تحاریر کو مزین کیا ہے اُس سے یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح عیاں ہے کہ اُن میں شاعری کے جراثیم بھی خاصی حد تک سرایت کناں ہیں۔ اشعار کی کچھ مثالیں درج ذیل ہیں۔

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے پلس میں ایسا نر پیدا

تفنن برطرف یہ شعر چیمہ صاحب جیسے اعلیٰ درجے کے منتظم اور نیک نام پولیس افسر پر پوری طرح صادق آتا ہے۔

کرنی پڑے جو نوکری مال حرام کے بغیر
ایسے ہے جیسے ناشتہ مکھن و جام کے بغیر

ایک عمر رسیدہ گلوکار سے گانے کی فرمائش پر اس کے جواب سے فیض احمد فیض کی روح کو یوں تڑپایا گیا ہے

گانا گانے لگوں تو منہ سے نکل جاتی ہے بانگ
مجھ سے پہلی سی محبت مری محبوب نہ مانگ

کسی چھیتے رشوت خور و رشوت رساں افسر کی سالانہ خفیہ رپورٹ کو درج ذیل شعر سے بہتر تفسیر نہیں کیا جاسکتا تم جسے سمجھے۔۔۔ کیسی قطب و ولی کی داستاں شہر کے اک راشی افسر کی یہ اے سی آر ہے

علامہ اقبال کی زمین میں اس سے بہتر مزاحیہ شعر شاید ہی کہا جاسکتا ہو

کسی چھیتے رشوت خور و رشوت رساں افسر کی سالانہ خفیہ رپورٹ کو درج ذیل شعر سے بہتر تفسیر نہیں کیا جاسکتا

تم جسے سمجھے۔۔۔ کسی قطب و ولی کی داستاں
شہر کے اک راشی افسر کی یہ اے سی آر ہے

علامہ اقبال کی زمین میں اس سے بہتر مزاحیہ شعر شاید ہی کہا جاسکتا ہو

یہ شریف وسادہ ملا۔۔ جو چلا ہے مسجدوں میں
اسے کیا خبر کہ کیا ہے رہ و رسم خرم سازی

نذرانوں کی کیش اور کائنڈ دونوں طرح سے وصولی کے حوالے سے گلوکار غلام علی کی یاد اس طرح دلائی گئی ہے۔

بھاویں کیش ہووے تے بھاویں مال ہووے
وکھو وکھ ۔۔۔۔۔۔ دوہاں دیاں لذتاں نیں

خربوزوں کے ہاتھوں میں ہے اقوام کی تقدیر
ہر آم ہے ۔۔۔۔۔ ملت کے مقدر کا ستارہ

ضرب المثل قسم کے مصرعوں سے دست درازی کی چند مثالیں بھی حاضر خدمت ہیں۔

جا تجھے کشمکش مہر سے آزاد کیا
لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی حجامت کا
وہ جا رہی ہے ساتھ کسی تھانے دار کے
اسی کشمکش میں گزریں مری پچھلی تین راتیں

علاوہ ازیں فقرہ سازی میں بھی چیمہ صاحب مشتاق احمد یوسفی اور انور مقصود کے نقش قدم پر چلتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔ انہوں نے اردو ادب میں کچھ نئی تراکیب کا بھی اضافہ بھی کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قاری ان کی رواں دواں تحریر کے بہاؤ میں بہتا ہوا اچانک ٹھٹھک کر رک جاتا ہے۔ کوئی فقرہ کوئی ترکیب اس کے پاؤں یہ کہتے ہوئے پکڑ لیتی ہے کہ یہاں رک جاؤ، دوبارہ سے بارہ پڑھ کر اس نثر پارے کا پورا مزہ لو۔

صفحات پر مشتمل اس کتاب کو دو چار نشستوں میں بھی ختم کیا جا سکتا تھا مگر پہلے تین چار مضامین پڑھنے کے بعد میں 207 نے اسے قدرے ست رفتاری سے پڑھنا شروع کر دیا تا کہ کتب بینی کے حوالے سے کچھ دن اچھے گزر جائیں۔ اس تصنیف پر میرے حتمی تاثرات یہ ہیں کہ پاکستان میں مزاح نگاری کی دم توڑتی ہوئی روایت کو زندہ رکھنے کی جانب یہ ایک اہم ترین قدم ہے۔ قارئین اردو ادب کو طنز و مزاح نگاری پر مشتمل ایک معیاری کتاب کا تحفہ دینے پر ذوالفقار احمد چیمہ صاحب بجا طور پر مبارکباد کے مستحق ہیں۔

جہدِ مسلسل: قانون، اصول اور جرأت کی علامت

علامہ عبدالستار عاصم/لاہور

محترم جناب ذوالفقار احمد چیمہ کی شخصیت کو چند جملوں میں بیان کرنا آسان نہیں، کیونکہ ان کی زندگی ایک جہدِ مسلسل کی داستان ہے۔

ذوالفقار احمد چیمہ کی زندگی اور خدمات خود ایک زندہ کتاب کی طرح ہیں، جس کے ہر صفحے پر اصول، جرات اور دیانت کے روشن ابواب درج ہیں۔ نیک والدین کی پرورش اور خالص دعاؤں نے ان کے کردار کی بنیاد رکھی، جس کی بدولت انہوں نے دیانت، اصول پسندی اور شرافت کی ایسی مثال قائم کی جو ہر وقت قابلِ تقلید ہے۔ ان کی شخصیت میں ایک عجیب ہم آہنگی ہے: طاقت اور نرم دلی، جرات اور انصاف، نظم و ضبط اور انسانی ہمدردی۔ یہی وہ صفات ہیں جو ہر امتحان میں انہیں سرخرو کر گئیں اور انہیں ایک مثالی عوامی خدمتگار بنایا۔

جہدِ مسلسل صرف ایک کتاب نہیں، بلکہ ہر افسر اور ہر انسان کے لیے عزم، استقلال اور قانون کی بالادستی کی عملی رہنمائی ہے۔

ابتدائی زندگی سے ہی ان کی شخصیت نکھری۔ دیہی ماحول، سادہ زندگی، اور باکردار والدین نے ان کی بنیادی تربیت کی، جبکہ ابتدائی اساتذہ نے علم کے ساتھ نظم و ضبط اور خود اعتمادی کی قوت دی۔ کیڈٹ کالج حسن ابدال میں قیادت، نظم، اور مقابلہ کی فضا نے ان کے بڑے خواب دیکھنے کے حوصلے کو پروان چڑھایا، اور گورنمنٹ کالج لاہور نے فکری وسعت، مباحثے کی صلاحیت اور اعتماد عطا کیا۔ پنجاب یونیورسٹی کے لاء کالج میں قانون کی تعلیم نے ان کے اندر انصاف اور آئین کی بالادستی کا شعور پروان چڑھایا۔ وکالت کے عملی تجربے اور سی ایس ایس کے سفر نے محنت اور عزم کے ذریعے نئی راہیں کھولیں، جبکہ سول سروسز اکیڈمی میں پیشہ ورانہ تربیت نے قیادت اور نظم و نسق کی صلاحیتوں کو جلا بخشی۔ سہالہ اور سواں میں عملی تربیت نے خدمت، جرات، اور قانون کی پاسداری کو عملی شکل دی۔ ابتدائی تعیناتوں نیانہیں زمینی حقائق سے روشناس کرایا اور عملی قیادت کا آغاز ہوا۔

جناب ذوالفقار احمد چیمہ کی پولیس سروس کے ابتدائی اور ترقی یافتہ مراحل میں انہیں متعدد چیلنجنگ تعیناتیاں ملیں، جن میں سوئی، ڈیرہ بگٹی، کاہان، اور گڑھی خدا بخش شامل ہیں۔ ہر تعیناتی پر انہوں نے قانون کی بالادستی قائم رکھی اور لوگوں کو تحفظ فراہم کیا۔ فرنٹیئر کانسٹیبلری اور اوگی میں عملی تربیت کے بعد انہوں نے پہلی سب ڈویژن پاکپتن کی کمان سنبھالی اور مظفرگڑھ و بھلوال میں سنگین جرائم اور لرزہ خیز وارداتوں کا مقابلہ کیا۔

چیمہ صاحب نے ثابت کیا کہ اصولوں پر قائم رہنا آسان نہیں، مگر وہی راستہ سب سے زیادہ معزز اور یادگار ہوتا ہے۔

ابتدائی خدمات میں پولیس کپتانی، ایم این اے کی غیر قانونی سرگرمیوں کے خلاف کارروائیاں، راولپنڈی سے تبادلہ، کوتوال شہر لاہور میں خدمات، کرائم کنٹرول کمیٹی کی قیادت، ٹنڈ آپریشن، اور مرغا سکینڈل سمیت جلوسوں اور سیاسی سرگرمیوں کے نظم و نسق نے ان کی غیر معمولی قیادت اور جرات کو نمایاں کیا۔

جہدِ مسلسل کے ہر حرف میں ان کی ذاتی جدوجہد، عوام کی خدمت اور دیانت کی مثال نظر آتی ہے۔

ان کی تحریر اور خدمات دونوں ایک دوسرے کو مکمل کرتے ہیں؛ ایک کے بغیر دوسرے کی روشنی ادھوری ہے۔

ان کی زندگی میں یادگار لمحے بھی کم نہیں۔ میڈم نور جہاں کے گھر کھانے اور گانے، بے نظیر بھٹو کی ہائیکورٹ میں پیشی، وکیل کے خلاف قذف کا مقدمہ، اور صحافیوں و دانشوروں کے تذکرے ان کے تجربات کی گواہی دیتے ہیں۔ لاہور سے رخصتی کے بعد رحیم یار خان میں نئی تعیناتی اور کھلی کچہری نے ان کے تجربات کو مزید گہرا اور جامع بنایا۔ ان کی خدمات اور تجربات میں متعدد چیلنجنگ مواقع شامل تھے: ڈاکوؤں سے فیصلہ کن مقابلے، وزیراعظم کے بلاوے پر نوجوان ایس پی کے طور پر وزیراعظم سے مکالمہ، مظلوموں کے لیے امید و حوصلے کا استعارہ بننا، سرکاری عمرے کی روداد، اور وزیراعظم کی حبیب جالب کے گھر آمد۔ ایوانِ صدر میں سازشیں، حکومت کا خاتمہ، سپریم کورٹ کے فیصلے، ایف سی شبقدر میں تعیناتیاں، صدر بھٹو کے قیدی دروازوں کی رہائی کے احکامات، قلعہ شبقدر میں چرچل کی رہائش گاہ اور افریقہ میں پیس کپتانی جیسے منفرد تجربات نے ان کی قائدانہ صلاحیت کو مزید اجاگر کیا۔ وکٹوریا فال اور جنوبی افریقہ کی سیر، شبقدر کی دوبارہ کمان، پنجاب میں واپسی، وزیراعظم کی تقریب حلف وفاداری، پرائم منسٹر ہاؤس کے ابتدائی اجلاس، احتساب اور سیف الرحمٰن

CS CamScanner

کے معاملات، وزیر اعلیٰ سندھ اور ایم کیو ایم کی ناراضگی، اور پولیس چیف آف لاہور کی ذمہ داری نے ان کے کیریئر کو غیر معمولی، متنوع اور مثالی شکل دی۔

جہدِ مسلسل کا عملی نمونہ ذوالفقار احمد چیمہ کی ہر تعیناتی میں نظر آتا ہے۔ گوجرانوالہ میں انہوں نے ایک دیانتدار ٹیم کے ساتھ سنگین جرائم کا خاتمہ کیا اور خطے کو امن کا گہوارہ بنایا۔ شیخوپورہ میں امن بحال ہوا، جرائم کم ہوئے اور شہری خود کو محفوظ محسوس کرنے لگے۔ تھانوں سے رشوت کلچر کم ہوا اور ملازمین کی فلاح پر توجہ دی گئی۔ 2013ء میں پاسپورٹ بحران کے دوران بطور ڈائریکٹر جنرل انہوں نے تین ماہ میں محکمہ سنبھال لیا۔ موٹروے پولیس کے سربراہ کے طور پر قانون کی بالادستی قائم کی اور بااثر افراد بھی کارروائی سے بچ نہ سکے۔ بعدازاں NAVTTC کو فعال اور مؤثر ادارہ بنایا۔ ان کا پیغام واضح تھا : Nothing is impossible عزم ہو تو سب کچھ ممکن ہے۔

ذوالفقار احمد چیمہ کی خدمات میں نوجوانوں کو خودانحصاری کی راہ دکھانے اور اداروں کی کارکردگی و وقار میں اضافہ کرنے کا واضح کردار ہے۔ اصولوں پر ثابت قدم رہنے اور غیر قانونی احکامات نہ ماننے کی وجہ سے تبادلے بھی برداشت کیے، مگر ہر تعیناتی پر عوام کو بہتری نظر آئی۔ 2007ء میں پرویز مشرف کی ایمرجنسی کے دوران بطور ڈی آئی جی کوہاٹ، انہوں نے بے گناہوں کی گرفتاری سے انکار کیا، یوں یہ واحد ڈویژن رہا جہاں کوئی گرفتاری نہ ہوئی۔ 2010ء کے ضمنی انتخاب میں سیاسی دباؤ کے باوجود پولیس کو غیر جانبدار رکھا۔

ذوالفقار احمد چیمہ کی وفاداری کسی حکومت سے نہیں بلکہ ریاست اور قانون سے تھی، جس کی بنیاد محمد علی جناح کی ہدایات ہیں۔ گوجرانوالہ کے ضمنی انتخاب میں انہوں نے پولیس کو مکمل غیر جانبدار رکھا اور حقدار کو حق دلایا۔ اس جرات کی قیمت انہیں فوری تبادلے کی صورت میں چکانی پڑی، مگر قانون کی بالادستی کی یہ مثال آج بھی یاد کی جاتی ہے۔ مزارِ قائد پر کیا گیا ان کا عہد اور ان کی کتاب دوٹوک باتیں ہر سول سرونٹ کے لیے مشعلِ راہ ہیں۔

بطور مصنف بھی ذوالفقار احمد چیمہ ہمہ جہت شخصیت کے حامل ہیں۔ ان کی نمایاں کتابوں میں Straight Talk، افکار تازہ اور دوٹوک باتیں شامل ہیں، جبکہ خودنوشت جہدِ مسلسل تکمیل کے مراحل میں ہے۔ ان کے کالم روزنامہ ایکسپریس میں شائع ہوتے ہیں، جو امید، عمل اور اصلاحِ معاشرہ کا پیغام دیتے ہیں۔ ان کی تحریر میں کردار کی قوت جھلکتی ہے، جیسا کہ حمید گل نے کہا کہ ان کی تحریر کے پیچھے ان کے کردار کی طاقت ہے۔ یوں وہ دیانت، جرات اور یقینِ محکم کی علامت بن کر سامنے آتے ہیں۔

محترم ذوالفقار احمد چیمہ وہ نایاب شخص ہیں جو نہ صرف قانون کی بالادستی کے علمبردار ہیں بلکہ عوام کے دلوں میں بھی ایک روشن مقام رکھتے ہیں۔

ان کی کتاب جہدِ مسلسل ہمیں یہ سکھاتی ہے کہ حوصلہ، دیانت اور اصول پسندی کے بغیر کوئی بھی کامیابی پائیدار نہیں ہوسکتی۔

ان کی زندگی اور کتاب دونوں یہ پیغام دیتی ہیں : عزم اور جہد کے بغیر کچھ بھی ناممکن نہیں۔

آخر میں صرف اتنا کہوں گا کہ جناب ذوالفقار احمد چیمہ کی زندگی ایک روشن مثال ہے کہ کس طرح اصول، دیانت اور حوصلے کے ساتھ ہر مشکل کا مقابلہ کیا جا سکتا ہے۔ ان کی شخصیت اور خدمات نوجوان نسل کے لیے مشعلِ راہ ہیں اور ان کی کتاب جہدِ مسلسل ہر فرد کو عزم و ہمت اور قانون کی بالادستی کی اہمیت سکھاتی ہے۔ ان کا ہر قدم ایک سبق ہے کہ حالات چاہے جیسے بھی ہوں، عزم اور اصولوں کے ساتھ سب کچھ ممکن ہے۔

ماہنامہ الحمرا لاہور

بہ یادِ حضرت مولانا حامد علی خاں

ادب کا چراغ، روایت کا امین یہ رسالہ حضرت مولانا حامد علی خاں رحمہ اللہ کی یادگار کے طور پر شائع کیا جاتا ہے۔

لاہور کا معروف ادبی رسالہ جو برسوں سے اردو ادب کی خدمت انجام دے رہا ہے۔

ادب نواز شخصیت شاہد علی خاں کی زیرِ ادارت

شاعری، افسانہ، تنقید، تحقیق، تراجم، محفلِ احباب، خصوصی گوشے، ہر شمارہ ایک نیا زاویہ، ایک نئی خوشبو

اگر آپ ادب سے محبت رکھتے ہیں یا خود کو قلم سے جوڑنا چاہتے ہیں تو ماہنامہ ''الحمرا'' میں آپ کا پرخلوص خیر مقدم ہے!

اپنی تخلیقات ارسال کریں اور اردو ادب کے اس قافلے کا حصہ بنیں

J-24 ماڈل ٹاؤن لاہور، 0333-4001844

مسجد نبویؐ کے روح پرور مناظر

فقیراللہ خاں/امریکا

لاکھوں کی تعداد میں زائرین سیدھی صفوں میں بیٹھے ایک سحر طاری کرنے والے سماں کے منتظر ہیں۔ اس معطر فضا میں نہ تو کوئی شور ہے نہ بھنبھناہٹ، نہ کوئی آواز نہ سرسراہٹ۔ کسی کے ہاتھ میں تسبیح ہے تو کسی کے ہاتھ میں قرآن پاک جو خاموشی سے تلاوت میں مشغول ہے۔ اس مخلوق خدا کے سمندر میں تین چار سال کے بچے بچیاں بھی موجود ہیں اور بوڑھے بھی، آنکھوں والے بھی ہیں اور نابینا بھی، بیساکھیوں کے سہارے چلنے والے بھی اور پیدل چلنے سے معذور وہیل کرسیوں پر بھی۔ ایک طرف سیاہ عبایوں میں ملبوس خواتین کی کثیر تعداد بھی موجود ہے۔ دنیائے اسلام کی دوسری بڑی مسجد، مسجد نبوی میں پن ڈراپ خاموشی کا ماحول طاری ہے۔

معاً سکوت کو توڑتی ہوئی موذن کی آواز شروع ہوتی ہے اللہ اکبر، اللہ اکبر، اللہ اکبر، اللہ اکبر

سب حاضرین کے دلوں کی دھڑکن سے اللہ اکبر کی خاموش صدا محسوس کی جاتی ہے۔ گویا کسی خالق کی حقانیت کی گواہی دی جا رہی ہے۔ موذن بالترتیب چار دفعہ اللہ اکبر پکارنے کے بعد اشہدان لا الہٰ کی صدا بلند کرتا ہے۔ جونہی موذن اشہدان محمد الرسول اللہ کی صدا لگاتا ہے تو ہر ایک کی نظریں سبز گنبد کے مکیں کی طرف اُٹھ جاتی ہیں۔ جب موذن دوبارہ اشہدان محمد الرسول اللہ کہتا ہے تو دلوں کی دھڑکن تیز ہو جاتی ہے، آنکھوں کی مژگاں بھیگ جاتی ہیں۔

اذان کے بعد اقامہ کے لیے سب نمازی امام کی اقتدا میں قبلہ رو ہو کر کھڑے ہو جاتے ہیں اور قرأت سننے لگتے ہیں۔ امام سورہ فاتحہ کے بعد اکثر وہی سورۃ تلاوت کرتے ہیں جو آپؐ کے قیامِ مدینہ کے دور میں نازل ہوئیں۔ امام صاحب کہتا ہے یـــا ایھا النبی، یا ایھا المزمل، یا ایھا المدثر تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ جناب رسول اللہؐ سے براہِ راست مخاطب ہیں۔ ایسے لگ رہا ہے جیسے قرآن ابھی ابھی نازل ہو رہا ہے۔ کیسا سہانا منظر ہوگا جب حضرت جبریل یہ آیات اللہ کی طرف سے حضور علیہ السلام کی خدمت میں پیش کرتے ہوں گے۔ قلب و روح میں وہ نقشہ آنکھوں میں محسوس ہونے لگتا ہے۔

حقیقت میں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جناب آقائے دو جہاں سبز گنبد کی چھتری تلے اقامت پذیر ہیں اور اردگرد صحابہ کرام مکئی کے دوھیا دانوں کی طرح آنحضورؐ کا احاطہ کیے ہوئے ہوں اور حضرت بلال کی اذان کا چودہ سو سال قبل کا منظر آنکھوں کے سامنے لوٹ آیا ہے۔ لاکھوں زائرین کی آنکھیں اشکبار ہیں اور وہ اپنی قسمت پہ نازاں ہیں کہ وہ آج آنحضورؐ کی محفل میں حاضر ہیں۔ ایسے موقع پر اُن کی قسمت بھی ناز کرتی ہے جو ایک ٹھاٹھیں مارتی رحمت کے بادلوں کی طرح لاکھوں زائرین وحاضرین کے سروں پر سایہ فگن ہے۔ دل چاہتا ہے کہ یہ کیفیت جاری وساری رہے۔

آنحضورؐ کے وصال کے بعد حضرت بلالؓ کی حالت عجیب ہو گئی تھی۔ اس قدر بے چین ہو گئے کہ ایک دن اپنے محسن حضرت صدیق اکبرؓ خلیفہ اوّل سے عرض کی ''اے اللہ کے رسولؐ کے خلیفہ آپ نے مجھے اللہ کے لیے آزاد کیا ہے اپنی مصاحبت کے لیے؟ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے فرمایا ''اللہ کے لیے'' حضرت بلال بولے ''میں نے اللہ کے رسول ﷺ سے سنا ہے کہ راہِ خدا میں جہاد کرنا مومن کا سب سے بہتر کام ہے، اس لیے میری خواہش ہے کہ پیامِ اجل تک اس عمل خیر کو اپنا مقصد حیات بنالوں۔''

اس سے حضرت بلالؓ کی اس دلی کیفیت کا اندازہ ہوتا ہے جو حضورِ اکرم ﷺ کے اس فانی دنیا سے تشریف لے جانے کے بعد پیدا ہو گئی تھی۔ وہ سوچتے تھے کہ اذان جو اُن کا محبوب ترین مشغلہ تھا اس سے دل نہ بہلتا تھا۔ وہ سوچتے تھے کہ اب اشہدان محمد الرسول کا اعلان کریں گے تو کس طرح۔ یہ مقدس کلمات ادا کرتے وقت اب وہ نورانی چہرہ نہیں دیکھ پائیں گے، جس کی وہ گواہی دیتے تھے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ کی دلی کیفیت سے پوری طرح آگاہ تھے۔ حضور ﷺ کی رحلت کے بعد اُن کے اندر غم واندوہ کا سیلاب اُمنڈ آیا تھا۔ اُس کے آگے حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ بند نہیں باندھ سکتے تھے۔ خلیفۃ المسلمین نے فرمایا:

''بلالؓ! میں تمہیں اللہ کا واسطہ دیتا ہوں کہ تم مجھے اس عالم پیری میں داغ مفارقت نہ دو۔'' حضرت بلالؓ پر اس موثر فرماں کا یہ اثر ہوا کہ عہد صدیقی میں کسی جنگ کے لیے مدینہ سے باہر نہ گئے۔

حضرت صدیق اکبرؓ کے وصال کے بعد حضرت بلالؓ نے خلیفہ دوم حضرت عمرؓ سے شرکت جہاد کا عندیہ ظاہر کیا۔ انہوں نے بھی خلیفہ اوّل کی طرح روکنا چاہا لیکن حضرتِ بلالؓ کا تقاضا بڑھتا چلا گیا۔ آخر بے حد اصرار کے بعد حضرت عمرؓ سے اجازت مل گئی اور اس کے بعد حضرت بلالؓ شامی مہم میں شریک جہاد ہو گئے۔

حضرت بلالؓ کو ملک شام کی سرسبز و شاداب سرزمین پسند آ گئی۔ انہوں نے اُس وقت حضرت فاروق اعظمؓ سے درخواست کی کہ اُن کو یہاں مستقل سکونت کی اجازت دی جائے۔ حضرت عمرؓ نے اس پر غور کیا اور حضرت بلالؓ کی دلی کیفیت کو محسوس کرتے ہوئے اُن کی درخواست منظور کر لی اور آپ نے قصبہ خولان میں مستقل سکونت اختیار کر لی۔

حضرت بلالؓ کو ملک شام میں رہتے ہوئے ایک مدت گزر گئی۔ ایک رات جناب رسول اللہ ﷺ کی خواب میں زیارت ہوئی۔ آپؐ فرما رہے ہیں "اے بلالؓ! کیا تمہارے لیے وہ وقت نہیں آیا کہ تم ہماری زیارت کرو؟" اس خواب نے عاشق رسول کو تڑپا کر رکھ دیا۔ اس خواب نے حضرت بلالؓ کے دل میں ایک ہلچل پیدا کر دی۔ نبی اکرم ﷺ کی بابرکت محفلوں میں گزرے ہوئے لمحات آنکھوں میں گھومنے لگے۔ اسی وقت رخت سفر باندھا اور مدینہ کا رُخ کیا۔ طویل مسافت کی تھکاوٹ کو بالائے طاق رکھتے ہوئے سیدھے روضہ اقدس پر حاضر ہوئے تو صبر و قرار کا یارا نہ رہا اور فراق حبیب میں اس قدر روئے کہ دیکھنے والوں کی آنکھوں سے بھی سیل اشک رواں ہو گیا۔

اس موقع پر حضرت حسنؓ اور حضرت حسینؓ بھی موجود تھے۔ اپنے محبوب کے جگر گوشوں کو سینے سے لگایا اور اُن کا منہ اور سر چومتے رہے، چمٹا کر پیار کرنے لگے۔ انہوں نے خواہش کی کہ "بابا بلالؓ! کل صبح مسجد نبوی ﷺ میں فجر کی اذان روضۂ رسول ﷺ پر آپ دیں۔" بلالؓ اپنے آقا کے جگر گوشوں کی خواہش کو کیسے ٹال سکتے تھے۔ فجر ہوئی تو روضۂ رسول ﷺ کے قریب اذان کے لیے کھڑے ہو گئے۔ حضرت بلالؓ نے اللہ کی کبریائی کا کلمہ بلند کیا۔ جونہی انہوں نے اذان دینی شروع کی تو تمام مدینہ گونج اٹھا۔ سارے شہر کی فضا حشر ساماں ہو گئی۔ گلیوں میں در و دیوار پر سکتہ طاری ہو گیا۔ آپ کا عہد مبارک لوگوں کے سامنے آ گیا۔ جب حضرت بلالؓ نے اشہد ان محمد الرسول اللہ کہا تو مدینہ کی گلیوں میں نماز کے لیے مسجد میں آنے والے نمازیوں کے قدم وہیں رُک گئے۔ پردہ نشین خواتین بھی بے تاب ہو کر گھروں سے باہر نکل کر مسجد کا رُخ کرنے لگیں۔ پورے مدینہ پر سکتہ طاری ہو گیا۔ لوگوں کی روتے روتے ہچکیاں بندھ گئیں۔ جب یہ مبارک الفاظ ایک عاشق رسول کی زباں سے نکلے تو باقی عاشقان رسول ﷺ کی اس وقت کی حالت بیان کرنا کسی کے بس کی بات نہ تھی۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ آقائے دو جہاں ﷺ نے آج ہی دنیا سے وصال فرمایا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ مدینہ میں ایسا دلدوز اور پراثر منظر آج تک دیکھنے میں نہیں آیا۔

اسد الغابہ میں لکھا ہے کہ حضرت بلالؓ نے عہد فاروقی ہجری ۲۰ میں شام میں وفات پائی۔ اس وقت آپ کی عمر ۶۱ برس تھی۔ جب مدینہ میں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو حضرت بلال رضی اللہ عنہ کی رحلت کی خبر پہنچی تو خلیفہ رسول ﷺ روتے روتے نڈھال ہو گئے اور بار بار فرمانے لگے: "آہ! ہمارا سردار بلالؓ بھی ہمیں داغ مفارقت دے گیا۔"

کچھ ایسا ہی منظر ہر نمازی کی آنکھوں کے سامنے تھا۔ وہی مدینہ ہے، وہی گلیاں، وہی راستے۔ قریب ہی کہیں ایک اور عاشق رسولؐ حضرت ایوب انصاری رضی اللہ عنہ کی رہائش گاہ جو جناب آقائے دو جہاں ﷺ کی اقامت گاہ قرار پائی، جو اس وقت مسجد نبوی ﷺ ہی کا حصہ ہے۔ نماز کی ادائیگی کے بعد ہزاروں زائرین جو روضۂ رسول ﷺ پر ہدیہ درود و سلام پیش کرنے کے لیے طویل قطاروں میں کھڑے اپنی باری کے منتظر ہیں، بعد از درود و سلام اپنی اپنی اقامت گاہوں کی طرف چل پڑتے ہیں اور جاتے جاتے دل کی دھڑکنوں سے اشہد ان محمد الرسول اللہ کی صدائیں نکل رہی ہوتی ہیں۔

چوتھی ملاقات.....؟

ایک دن دوران قیام مدینہ مسجد نبوی ﷺ میں ایک بزرگ باباجی سے ملاقات ہوئی۔ باباجی میرے برابر دائیں ہاتھ تشریف فرما تھے۔ ہنس مکھ شکل، بڑھاپے کے باوجود چہرے سے مُرجھائے ہوئے نہیں لگتے تھے بلکہ بقائم حواس تھے۔ شلوار قمیض زیب تن تھی، جس سے نفاست جھلکتی تھی۔ قد کوئی پانچ فٹ ہو گا۔ میں نے پاکستانی ہونے کے ناطے سلام کیا اور خیریت دریافت کی۔ میں نے گفتگو شروع کرنے کی غرض سے پوچھا "آپ عمرہ و زیارت کے سفر میں ہیں؟" انہوں نے اثبات میں سر ہلایا۔ پھر میں نے پوچھا "آپ اکیلے ہیں یا فیملی کے ساتھ؟" کہنے لگے "میرا پوتا میرے ساتھ ہے جو کہ اگلی صف میں بیٹھا تلاوت قرآن میں مشغول تھا اور جس کی عمر کوئی ساٹھ برس کے اوپر تھی۔ میں نے اس سے باباجی کی عمر دریافت کیا تو کہنے لگا اس وقت ان کی عمر 105 برس ہے۔ ابھی یہ گفتگو ہو ہی رہی تھی کہ اس کے پوتے نے جانے کا اشارہ کیا اور وہ مسجد نبویؐ سے باہر کی طرف چل پڑے۔ باباجی چلنے کے لیے ایسے اُٹھے جیسے کوئی نوجوان اُٹھتا ہے، نہ کسی کا سہارا اور نہ ہاتھ میں کوئی چھڑی۔ یہ نہ صرف میرے لیے حیرانی کی بات تھی بلکہ اُن کی صحت دیکھ کے رشک آ رہا تھا۔ اُن کی مزید صحت کے لیے دُعائیں نکل رہی تھیں۔ ان کے جانے کے بعد دل میں حسرت رہی کہ ان سے یہ نہ پوچھ سکا کہ ان کا یہاں دیارِ حبیب میں پہلا وزٹ ہے، دوسرا یا

تیسرا؟

مسجد نبوی ﷺ میں جہاں لاکھوں کا اجتماع ہوتا ہے، کسی کا دوسری دفعہ ٹکرا جانا یا ملنا محال ہے۔ دل میں تشنگی لیے میں بھی مسجد سے باہر اپنے ہوٹل کی طرف چل پڑا۔ دوسرے دن بعد از نمازِ ظہر باہر صحن میں چھتریوں کے سایہ تلے اتفاقاً بابا جی ٹکرا گئے۔

دیکھ کر خوشی ہوئی۔ بابا جی ایسے چل رہے تھے جیسے آہستہ آہستہ دوڑ رہے ہوں۔ ان کی چال ہی کچھ ایسی تھی۔ ہاتھ میں کوئی عصا نہ چہرے پر عینک اور ماشاءاللہ عمر 105 سال۔

تیسرے دن ہم اپنے ہوٹل سے عصر کی نماز کے لیے مسجد نبوی ﷺ جا رہے تھے تو سامنے سے وہی بابا جی اپنے پوتے کے ہمراہ کندھے پر ہلکا سا بیگ اُٹھائے چلے آ رہے ہیں۔ موقع غنیمت جانا اور اُن کے پوتے سے بابا جی کا نام پوچھ لیا۔ پوتے نے کہا ’’عبدالعزیز، پوتے نے بتایا کہ یہ میرے دادا کوئٹہ کی ایک مسجد میں امامت کے فرائض سرانجام دیتے ہیں۔ پوتے نے بتایا کہ تین گھنٹہ بعد ہماری مدینہ ایئرپورٹ سے جدہ کی فلائٹ ہے۔ جدہ سے ہم مکہ عمرہ کے لیے عازم سفر ہوں گے۔

یہ ہماری بابا جی سے تیسری اور فی الحال آخری ملاقات تھی۔ ورنہ ایسے موقعون پر لاکھوں کے اجتماع میں کسی کا دوسری دفعہ ملنا ناممکنات میں سے ہے اور وہ بھی کسی اجنبی کے ساتھ۔ مجھے اُمید ہے اور دعا ہے کہ ہماری بابا جی سے اگلی اور چوتھی ملاقات جنت میں ہوگی اور ان شاءاللہ ضرور ہوگی۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کو بھی رحمتیں لٹانے کا بس بہانہ چاہیے اور ہم کو جنت میں جانے کا۔ (آمین)

کہاں میں کہاں یہ مدینے کی گلیاں
یہ قسمت نہیں ہے تو پھر اور کیا ہے

سفرنامہ

یورپ کے آئینے میں خودکلامی

حسن عباسی/ لاہور

(Karl Johan's Gate)

کارل جوہانس گیٹ اوسلو کی مرکزی سڑک ہے۔ اس کا نام بادشاہ چارلس تھرڈ جان کے اعزاز میں رکھا گیا تھا۔ دراصل یہ کئی قدیم اور دلکش گلیوں کا مجموعہ ہے۔ یہ اسٹریٹس وسیع اور کشادہ ہیں۔ میں جب بھی اوسلو آتا ہوں یہاں گھومنا پھرنا میرا محبوب مشغلہ ہے۔ قدیم عمارتوں کی دل کشی سے نظریں نہیں ہٹتیں۔ حسن تعمیر قابل داد ہے۔ ان کے پہلو بہ پہلو جدید عمارتیں بھی اپنی جھلک دکھلاتی ہیں۔ سڑک کے درمیان پیالہ نما گملوں میں سجے پھول ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔

نیلا آسمان، نرم دھوپ، شفاف منظر، پاس سے گزرتے ہوئے طمانیت سے سرشار خوب صورت چہرے جیسے ان کی زندگیوں میں غم نام کی کوئی چیز نہ ہو۔ سڑک کے دونوں طرف ریسٹورنٹس اور کافی شاپس کے باہر رنگا رنگ چھتریوں کے سائے میں سلیقے سے سجائی گئی کرسیاں اور میزیں، اردگرد کے ماحول سے بیگانہ محو گفتگو لوگ، یہ سب مجھے ایک سہانے سپنے کی طرح لگتا ہے۔

جس طرف رخ کریں تاحد نظر پرکشش دکانیں جہاں ضروریات زندگی کی تمام اشیاء گاہکوں کی راہ دیکھتی ہیں۔ دنیا کی مہنگی سے مہنگی برانڈز کا ہجوم ہیا وسلو کا شمار دنیا کے مہنگے ترین شہروں میں ہوتا ہے۔ پھر بھی سارا سال سیاح کھنچے چلے آتے ہیں۔ اوسلو میں دیگر ایشیائی ملکوں کے مقابل پاکستانیوں کی تعداد کافی زیادہ ہے۔ راہ چلتے ان سے ملاقات ہو جائے تو بہت اپنائیت سے ملتے ہیں۔ سڑکوں پر مانگنے والے بھی اپنی حدود و قیود میں رہ کر بے بسی کی تصویر نظر آتے ہیں لیکن ان کی طرف لوگوں کی نظر التفات نہیں ہوتی۔ اس شعبے کو حقارت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ البتہ جو بہروپیے فن کا مظاہرہ کر رہے ہوتے ہیں ان کے سامنے رکھیڈ بوں سے سکوں کے چھنکار کی آواز وقفے وقفے سے آتی رہتی ہے یہاں عظیم شخصیات کا روپ دھارے کچھ لوگ اسٹیچو کی طرح دم سادھے آپ کو نظر آئیں گیآپ ان کے ساتھ اپنی یادگار تصویر بنوا سکتے ہیں۔ ان گلیوں میں۔

سب کچھ اتنا دلچسپ ہے کہ مجھے واک کے دوران کبھی تھکن کا احساس نہیں ہوا۔ جگہ جگہ بے برگ یا سبز پیڑ، ان کے نیچے رکھے ہوئے اداس بینچ بھی یہاں کی خوب صورتی میں اضافہ کرتے ہیں میں واک کرتے ہوئے شاہی محل اور پارلیمنٹ کی عمارت تک ہر بار ضرور جاتا ہوں۔ یہاں پہنچ کر مجھے منزل پر پہنچ جانے کا احساس ہوتا ہے۔ 1840 کی دہائی کے دوران نئے تعمیر کیے گئے نارویجین شاہی محل کو باقی شہر سے جوڑنے والے راستے کے طور پر تعمیر کیا گیا۔ 1866 میں نارویجین پارلیمنٹ کی عمارت دو سابقہ الگ الگ گلیوں کے سنگم پر مکمل ہوئی۔ دونوں گلیوں کو ملا کر پوری سڑک کو کارل جوہانس گیٹ کا نام دیا گیا۔ یہاں بادشاہ کا مجسمہ بھی نصب ہے جس میں اسے گھوڑے پہ سوار شاہانہ انداز میں دکھایا گیا ہے۔ یہ مشہور مجسمہ ساز Bergslien Bryntulf کے فن کا شاہکار ہے۔

(جاری ہے)

ادبی تقریبات

رپورٹ نویداحمدراحت

معروف شاعر و مصنف عامر بن علی کی کتاب 100 تخلیق کار کی تقریب رونمائی ذکریا ہال میونسپل کمیٹی میاں چنوں میں منعقد ہوئی۔ تقریب کی صدارت ندیم بھابھہ نے کی جبکہ مہمان خصوصی عامر بن علی تھے۔تقریب دوحصوں پر مشتمل تھی۔ پہلے حصہ میں کتاب 100 تخلیق کار کے بارے میں بات کی گئی۔تقریب سے خطاب میں شرکاء محفل نے کتاب کے متعلق کہا کہ یہ ایک شاندار کتاب ہے جس میں سونامور شخصیات کے انٹرویوز شائع کیے گئے۔مصنف عامر بن علی نے کتاب کے متعلق کہا کہ ان شخصیات کے انٹرویو کرنے میں کافی عرصہ لگا اور پھران سب کو اکٹھا کر کے کتابی شکل دی گئی۔دوسرے حصہ میں بہت زبردست مشاعرے کا اہتمام کیا گیا۔شاعروں نے بہترین انداز میں اشعار پیش کر کے حاضرین سے خوب داد وصول کی۔شاعروں میں ندیم بھابھہ۔عون شاہ۔راکب مختار۔ندا فاطمہ۔دانش نقوی۔پروین سروش ۔نعمان راؤ۔اسد عباس۔بلال سرور حسنین ڈھڈی۔جبکہ اسسٹنٹ کمشنر میڈم ساجدہ رزاق نے انگلش میں اپنے تاثرات پیش کیے۔ جبکہ صاحب کتاب عامر بن علی نے بھی اپنا کلام پیش کر کے حاضرین سے خوب داد سمیٹی۔مہمانوں میں ایم پی اے رانا بابر حسین۔نامزد تحصیل مئیر مظہر ستار۔سماجی شخصیت حاجی عبدالستار۔سابق صدر میاں چنوں بار رانا فخر امام ایڈووکیٹ ۔ چیف آفیسر بلدیہ میڈم سمیر سمیع ۔رانا کاشف بھی شامل تھے۔اسسٹنٹ کمشنر میڈم ساجدہ رزاق نے تقریب سے اپنے خطاب میں کہا کہ شاعری ایک تخلیقی کام ہے، اسے ضرور سراہا جائے۔یونیورسٹی دور کی بات کرتے ہوئے کہا کہ اس وقت سے کچھ نہ کچھ نثر کی صورت میں لکھ رہی ہوں مگر شاعری ایک مشکل کام ہے۔ہمیں تخلیق کاروں کی محنت کو سراہنے کی ضرورت ہے۔یہ قوم کا اثاثہ ہوتے ہیں۔

❁❁❁

وطن عزیز کے مایہ ناز شاعر وادیب، پرائڈ آف پرفارمنس محترم احمد حسین مجاہد کی ادبی خدمات کے حوالے سے ہزارہ اباسین آرٹس کونسل کے زیر اہتمام۔

"جشن_ احمد حسین مجاہد" منایا گیا۔

صدارت کے فرائض معروف شاعر وادیب اور مایہ ناز ماہر تعلیم جناب واحد سراج نے ادا کیے۔۔مہمانان خصوصی میں نامور شاعر محترم میجر امان اللہ خان امان اور جناب اظہر علی راجہ شامل تھے جبکہ نظامت کے فرائض کونسل کے مشیر ادبیات اور راقم السطور(عبدالوحید بسمل) نے ادا کیے۔

پروگرام کا باقاعدہ آغاز تلاوت کلام پاک سے ہوا جسکی سعادت معروف قاری جناب سراج احمد قریشی نے حاصل کی۔

گلہائے عقیدت بحضور سرور کائنات حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ و علیہ وآلہ وسلم نچھاور کرنے کی سعادت کمال کے خوش الحان اور معروف نعت خواں جناب سید ازہر بخاری نے حاصل کی۔

جناب احمد حسین مجاہد کے فن و شخصیت ، اعزازات، تصانیف اور دیگر ادبی کارہائے گراں مایہ کے حوالے سے راقم نے مقالہ پیش کیا۔

معروف ادیب ڈاکٹر عادل سعید قریشی ، پروفیسر ملک ناصر داود، احمد ریاض، مادام محمودہ چوہدری ، پروفیسر اخلاق احمد اعوان ، ہردل عزیز شاعر وادیب اور معروف ادبی رسالے'' شعروسخن'' کے مدیر جناب جان عالم اور محترم شعیب احمد خان نے احمد حسین مجاہد کے ادبی سفر اور انکی شخصیت کے حوالے سے نہایت خوبصورت گفتگو سے محفل کو سرشار کیا۔

کونسل کی جانب سے احمد حسین مجاہد کی ادبی خدمات پر انھیں "ردائے ادب " کا اعزاز پیش کیا گیا، جس کی کاروائی صاحب صدارت جناب واحد سراج کے دست مبارک سے، کونسل کے سیکرٹری، وائس پریذیڈنٹ اور مشیر ادبیات اور تقریب کے مہمانان خصوصی کی معیت میں مکمل ہوئی۔۔

مہمانان خصوصی جناب میجر امان اللہ خان امان اور سابق ناظم محکمہ جنگلات جناب اظہر علی خان راجہ نے اپنے خطاب میں تقریب کے منتظمین اور کونسل کے ممبران کو جناب احمد حسین مجاہد کی ادبی خدمات پر اتنا خوبصورت جشن منانے پر خراج تحسین پیش کیا اور صاحب تقریب کو مبارک باد پیش کی۔

کونسل کے نائب صدر قاضی محمد زبیر نے شرکاء کا شکریہ ادا کرتے ہوئے پرائڈ آف پرفارمنس کے ملنے اور اس مقام تک پہنچنے میں درپیش مشکلات کا احاطہ بہت خوبصورت انداز میں کیا۔ صاحب تقریب جناب احمد حسین مجاہد نے اپنے ادبی سفر کو معروف شاعر جناب احمد فراز کے نام کرتے ہوئے تقریب کے شرکا سے نہایت خوبصورت خطاب کیا اور تمام شرکائے محفل اور ہزارہ اباسین آرٹس کونسل کے جملہ اراکین و منتظمین کا بالعموم اور جناب خالد وحید قریشی سیکرٹری، اور مشیر ادبیات کا اس عمدہ پروگرام کے کامیاب انعقاد پر بالخصوص شکریہ ادا کیا۔

تقریب کے صاحب صدارت جناب واحد سراج نے اپنے انتہائی فصیح خطاب میں جناب احمد حسین مجاہد کے ادبی سفر پر بھی سیر حاصل گفتگو کی اور احمد حسین مجاہد جیسی ادبی شخصیت کو پرائڈ آف پرفارمنس کے اجرا کو بذات خود اس ایوارڈ کی توقیر سے تعبیر کیا اور ان کی شخصیت پر بلند پائے کی گفتگو کرتے ہوئے ان کے وہ کارہائے نمایاں بھی شرکاء محفل کے گوش گزار کیے جن سے بہت سارے احباب ابھی تک واقف نہیں تھے۔ یہ پروقار تقریب تمام شرکا کی

تواضع پر اپنے اختتام کو پہنچی۔ اس تقریب کا خصوصی حسن یہ بھی تھا کہ اس میں ہزارہ بھر کے شعرا و ادبا اور معاشرے کے دیگر طبقوں سے تعلق رکھنے والی قابل احترام شخصیات کی ایک بڑی تعداد نے شرکت فرما کر ہزارہ اباسین آرٹس کونسل ہی نہیں یہاں کے بھی شاعروں، ادیبوں اور فنکاروں کا مان بڑھایا۔

❁❁❁

مورخہ 9 فروری
معروف ادبی تنظیم "سائبان
ویسٹ وڈ سوسائٹی 231/b ٹھوکر نیاز بیگ
کے زیر اہتمام ایک نہایت خوبصورت محفل
مشاعرہ کا انعقاد کیا گیا

جس کے روح رواں جناب حسین مجروح نے کراچی سے تشریف لائی شاعرات محترمہ کشور عروج، محترمہ ہما ساریہ اور کوئٹہ سے تشریف لائے شاعر جناب فیصل ریحان کے اعزاز میں اس محفل کو سجایا۔

مشاعرے کی صدارت ملک کے نامور شاعر جناب اعجاز کنور راجہ نے فرمائی۔ مہمان خصوصی محترمہ کشور عروج، محترمہ ہما ساریہ، محترم فیصل ریحان تھے۔

مشاعرے کی نظامت کے لیے راقم الحروف احمد سبحانی آکاش کا نام میں تجویز کیا گیا جسے سب دوستوں نے بہت پسند فرمایا۔

مشاعرے کے آغاز میں بانی تنظیم سائبان جناب حسین مجروح نے ادبی تنظیم سائبان کے اغراض و مقاصد کے حوالے سے چشم کشا تعارف اور کارکردگی کی رپورٹ پیش کی جن کا کہنا ہے کتاب پڑھیں اور خرید کر پڑھیں۔

حسین مجروح صاحب نے تن تنہا ہی ادبی تنظیم سائبان ، ادبی سرائے سائبان اور ادبی مجلے سائبان کے حوالے سے دوستوں کو آگاہ فرمایا اور اس کار خیر میں شمولیت کی دعوت بھی دی۔

لاہور کے علاوہ بھی کئی شہروں میں سائبان کی کارکردگی کے بارے میں گفتگو فرمائی۔

میں ذاتی طور پر حسین مجروح صاحب کو اس بے مثل کام پر خراج تحسین پیش کرتا ہوں جو کام بڑے بڑے ادارے اور تنظیمیں نہ کر سکیں وہی کام اس فرد واحد نے سرانجام دیا۔

حسین مجروح صاحب نے اپنی زندگی کو ادب کی ترویج اور ترقی کے لیے مختص کیا ہوا ہے اور وہ اس گھاٹے کے سودے پر مطمئن و شاد ہیں۔

اس کے بعد لاہور کے نامور شعراء کرام نے اپنے کلام سے محفل کو چار چاند لگائے رکھے۔

نہایت عمدہ اور مرصع کلام سننے کو ملا۔

مشاعرہ اپنے آغاز سے آخری شاعر تک بہت خوبصورتی سے اپنے مدارج طے کرتا گیا۔

اسی دورانیے میں چھوٹی چھوٹی گپ شپ کے شگوفے بھی پھوٹتے رہے

مشاعرے کے بعد ادبی تنظیم سائبان کی طرف سے چائے اور پرتکلف لوازمات کا دور چلا اور غیر رسمی طور پر تادیر ادبی و علمی گفتگو کے ساتھ ساتھ چٹکلے بھی چھوڑے جاتے رہے

یہ ایک نہایت عمدہ اور یادگار محفل رہی اس کی تصاویر آپ دوستوں کی نذر کر رہا ہوں اور انشاء اللہ جلد ہی ایک کے بعد ایک ویڈیوز بھی جاری کی جائیں گی۔ امید کرتا ہوں آپ اس پر لطف محفل کی روداد سے محظوظ ہوں گے۔

❁❁❁

میں پاکستان پریس کلب اسکاٹ لینڈ کی اپنی تمام ٹیم کی نہایت شکر گزار ہوں جنھوں نے میری ان ء کتاب کی اشاعت پر ایک شاندار تقریب پذیرائی کا اہتمام کیا اور عزت و تکریم سے نوازا اس کے ساتھ ساتھ قونصل جنرل رانا ثمر جاوید صاحب اور پریس کلب کے پیٹرن ان چیف Baillie حنیف راجہ صاحب کا خصوصی شکریہ ادا کرتی ہوں جنھوں نے تقریب میں شرکت فرما کر مجھے مزید عزت بخشی۔

تقریب کی مفصل رپورٹ پریس کلب کے اہم میڈیا نمائندے ماجد حسین صاحب کے قلم سے :

مجھے یہ بتاتے ہوئے فخر اور خوشی محسوس ہو رہی ہے کہ پاکستان پریس کلب اسکاٹ لینڈ نے اپنی ایک معزز سینیئر رکن

کلب کی وومن ونگ اور بزم شعر و نغمہ کی چیئر پرسن برطانیہ کی مشہور و معروف انٹرنیشنل شاعرہ محترمہ راحت زاہد صاحبہ کی اسکاٹ لینڈ کے قومی شاعر رابرٹ برنس کی نظموں کے اردو تراجم پر مشتمل کتاب "بھولی بسری یادیں " کی اشاعت کے بعد اردو ادب میں اس کارنامے کی پزیرائی کے لیے پاکستان پریس کلب اسکاٹ لینڈ کے ممبران نے مقامی ریسٹورانٹ میں ان کے اعزاز میں ایک شاندار تقریب کا انعقاد کیا جس کے مہمان خصوصی پاکستان قونصلیٹ گلاسگو کے قونصل جنرل رانا ثمر جاوید تھے

یاد رہے کہ اس سے قبل رابرٹ برنس کی نظموں کے تراجم بیالیس مختلف زبانوں میں ہو چکے ہیں

جبکہ اسکاٹ لینڈ کی تاریخ میں پہلی بار کسی پاکستانی نژاد شاعرہ نے ان کا اردو میں ترجمہ کر کے اور کتاب شائع کروا کے پوری پاکستانی کمیونٹی اور خصوصا "پاکستان پریس کلب اسکاٹ لینڈ کا سر فخر سے بلند کر دیا ہے

تقریب میں مہمان خصوصی رانا ثمر جاوید کے علاوہ کلب کے پیٹرن ان چیف راجہ محمد حنیف۔ صدر جنگ اور جیو نیوز کے بیورو چیف طاہر انعام شیخ۔ جنرل سیکرٹری مصطفیٰ علی بیگ سینیئر وائس پریزیڈنٹ میجر ماجد حسین سینیئر صحافی غلام نبی مہک عامر محترمہ راحت زاہد دیگر ایگزیکٹو ممبران میں محمد شاہد چوہدری ندیم عظمت عامر بٹ رانا راشد راجہ عابد حسین نے شرکت کی۔ تقریب کے کچھ حسین لمحات ماجد حسین کے کیمرے کی آنکھ سے۔

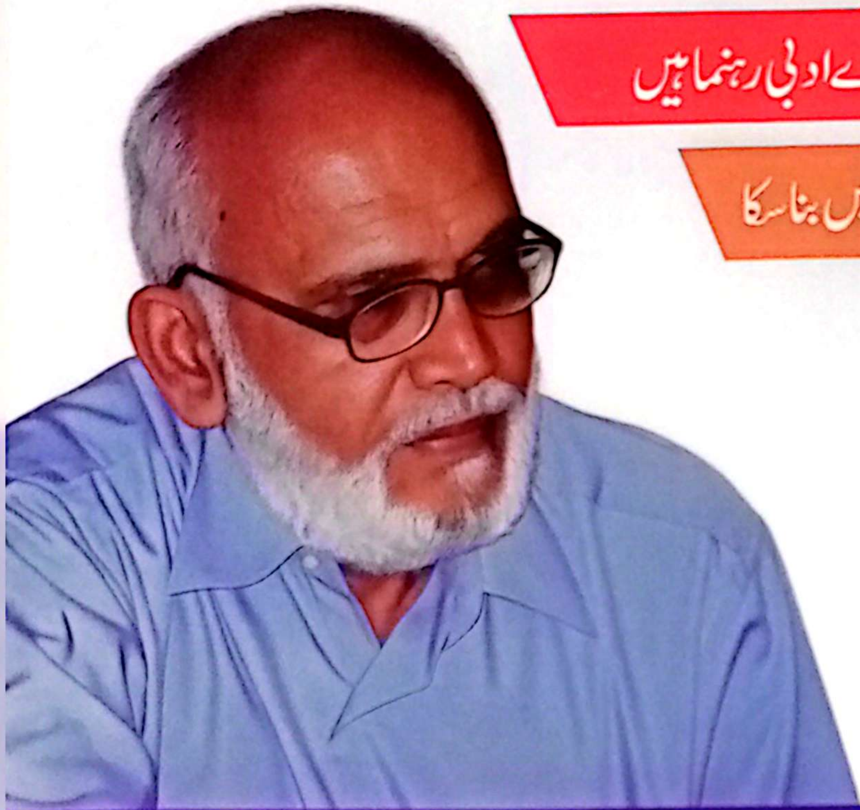

ادیب، دانش ور اور ناشر سید قاسم محمود میرے ادبی رہنما ہیں

آج کا پاکستانی ادب دنیا میں اپنی پہچان نہیں بنا سکا

ناشر، مدیر ادب لطیف، مدیر اعلیٰ بک ڈائجسٹ
منتظم کتاب ورثہ بانی و صدر بزمِ کتاب دوستاں

مظہر سلیم مجوکہ

سے مدیر ارژنگ حسن عباسی کا مکالمہ

ادب لطیف کی ادارت سنبھالنا واقعی ایک بہت بڑا چیلنج تھا۔ آج کے دور میں ادبی رسائل کو گوناگوں مسائل کا سامنا ہے

کتاب دوست، کتاب شناس اور مدیر اعلیٰ ''بک ڈائجسٹ'' لاہور مظہر سلیم مجوکہ 4 جون 1954ء کو سرگودھا اور جھنگ کے درمیان واقع قصبہ مجوکہ میں پیدا ہوئے جو دریائے جہلم کے دونوں کناروں پر واقع ہے۔ ضلع سرگودھا ہے جو پہلے ضلع شاہ پور کہلاتا تھا۔ تحصیل پہلے خوشاب تھی اب ساہی وال سرگودھا ہے۔ قوم مجوکہ حضرت قطب حیدر شاہ (ملک غازی) کے بیٹے ملک فرمان علی کھوکھر کی اولاد میں سے ہے۔ حضرت قطب شاہ حضرت علی المرتضیٰ کے غیر فاطمی بیٹے محمد الاکبر محمد حنیف کی اولاد میں سے ہیں۔ مورث اعلیٰ محمد معظم 600 ہجری میں ہوئے۔ قطب حیدر شاہ محمود غزنوی کے لشکر میں شامل ہو کر ہندوستان میں آئے۔

دادا ملک امیر خان فوج اور نانا ملک شہباز خان پولیس میں ملازم تھے۔ والد ملک احمد شیر خان فوج سے رسالدار میجر کے عہدے سے ریٹائر ہوئے۔ مظہر سلیم مجوکہ نے ابتدائی تعلیم جوکہ جھنگ، نوشہرہ چھاؤنی اور کھاریاں چھاؤنی سے حاصل کی۔ 1965ء کی پاک بھارت جنگ میں کھاریاں میں تھے۔ وہاں سے 1966ء میں والدین کے ہمراہ ملتان آ گئے۔ چھٹی سے میٹرک تک ملتان چھاؤنی کے ایف جی ہائی سکول نمبر 1 میں پڑھتے رہے۔ 1970ء میں یہاں سے میٹرک کیا۔ 1971ء میں علمدار حسین اسلامیہ کالج ملتان میں داخلہ لیا۔ مخدوم سید یوسف رضا گیلانی کے والد کے نام سے موسوم اس کالج میں یہ سب سے پہلے بیج میں شامل تھے۔ انٹرمیڈیٹ تک تعلیم حاصل کی اور اس کے بعد بہ وجوہ تعلیم تو جاری نہ رکھ پائے۔ مگر علم حاصل کرنے کی جستجو میں لگے رہے اور حصول علم کا یہ سفر اب تک جاری ہے۔

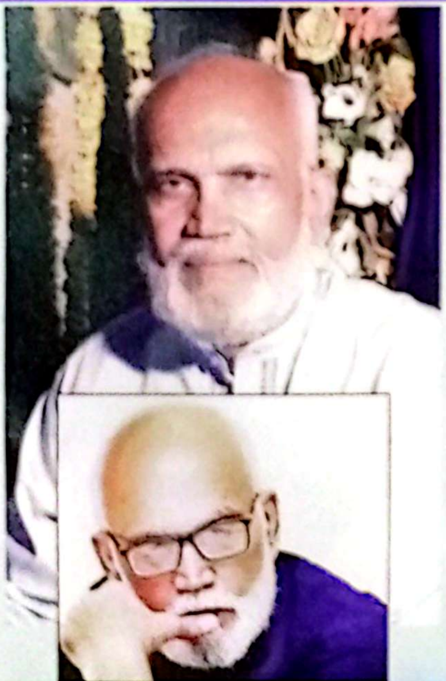

بقیہ اندرونی صفحات پر

استادِ سخن ڈاکٹر علی محمد خاں کی خودنوشت

"داستانِ حیرت" کی تقریب رونمائی و محفل مشاعرہ

صدارت: ڈاکٹر نجیب جمال | مہمان خصوصی: عامر بن علی | نظامت: ڈاکٹر عائشہ عظیم

مہمانانِ اعزاز

عبدالرزاق ایزد، ڈاکٹر اشفاق ورک، ڈاکٹر انیل سیموئیل، ڈاکٹر انیلہ سلیم، ڈاکٹر شاہدہ دلاور شاہ، ڈاکٹر سعدیہ حسن بلوچ، رانا محمد یوسف، ڈاکٹر نعیم بزمی، مرزا یٰسین بیگ، ڈاکٹر غفور شاہ قاسم

تصویری جھلکیاں

صاحب کتاب، صاحب صدر اور مہمان خصوصی

ڈاکٹر علی محمد خاں کی خودنوشت'' داستانِ حیرت'' کے حوالے سے منعقدہ تقریب رونمائی ایک باوقار، علمی اور ادبی فضا کی حامل تقریب تھی جس میں اہلِ علم، ادیبوں، شاعروں اور دانشوروں کی بڑی تعداد نے شرکت کی۔تقریب کا آغاز تلاوتِ کلامِ پاک سے ہوا، جس کے بعد منتظمین نے مہمانانِ گرامی کا تعارف پیش کیا۔صدارت کے فرائض ممتاز ادبی و علمی شخصیت ڈاکٹر نجیب جمال نے انجام دیے جبکہ ڈاکٹر عائشہ عظیم نے نظامت نہایت سلیقے اور شائستگی سے کی۔اس اپروقار تقریب کے مہمان خصوصی عامر بن علی جبکہ مہمانانِ اعزاز میں عبدالرزاق ایزد، ڈاکٹر اشفاق احمد ورک، ڈاکٹر انیل سیموئیل، ڈاکٹر انیلہ سلیم، ڈاکٹر نعیم بزمی، ڈاکٹر غفور شاہ قاسم، ڈاکٹر شاہدہ دلاور، ڈاکٹر سعدیہ حسن بلوچ، رانا محمد یوسف اور راقم تھے۔اس موقع پر ڈاکٹر علی محمد خاں کی علمی، تحقیقی اور ادبی خدمات پر تفصیلی روشنی ڈالی گئی اور ان کی خودنوشت کو اردو ادب میں ایک اہم اضافہ قرار دیا گیا۔مقررین نے'' داستانِ حیرت'' کو محض ایک شخصی آپ بیتی نہیں بلکہ ایک عہد کی فکری، تعلیمی اور تہذیبی تاریخ کا آئینہ قرار دیا۔انہوں نے کہا کہ اس خودنوشت میں مصنف کی ذاتی جدوجہد، علمی سفر، معاشرتی مشاہدات اور فکری ارتقا نہایت سادہ مگر پُراثر انداز میں بیان ہوا ہے۔کتاب میں خوداحتسابی، سچائی اور تجربات کی صداقت اسے ایک معتبر دستاویز بناتی ہے۔شرکا نے اسلوبِ بیان، زبان کی شگفتگی اور واقعات کے فطری تسلسل کو سراہا اور کہا کہ'' داستانِ حیرت'' نئی نسل کے لیے حوصلہ، رہنمائی اور فکری بالیدگی کا باعث بنے گی۔اس موقع پر کتاب کے چند منتخب اقتباسات بھی پیش کیے گئے جنہیں سامعین نے بے حد پسند کیا۔آخر میں خود مصنف ڈاکٹر علی محمد خاں نے اظہارِ خیال کرتے ہوئے حاضرین کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ یہ خودنوشت ان کے ذاتی تجربات کے ساتھ ساتھ اساتذہ، دوستوں اور اداروں کی محبتوں کا حاصل ہے۔دعا کے ساتھ تقریب اختتام پذیر ہوئی اور شرکاء نے کتاب کی رونمائی پر مصنف کو دلی مبارک باد پیش کی۔اس پروقار تقریب میں شعری نشست بھی ہوئی اور شعرا نے خوب داد سمیٹی۔اس موقع پر ڈاکٹر علی محمد خاں نے لذت کام ودہن کا بھی خصوصی اہتمام کیا تھا، ساگ مکھن اور گڑ والے چاولوں نے دیسی ٹچ دینے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔یہ تقریب بلاشبہ ایک یادگار ادبی نشست ثابت ہوئی جس نے اردو ادب میں ایک اہم کتاب کے تعارف کو وقار اور وقعت عطا کی۔

Read Arxang online
www.amirkhanali.com
www.millat.com

براہ راست منگوانے کے لیے رابطہ کریں

نستعلیق Publications

غزنی سٹریٹ • اردو بازار • لاہور
0300-4489310 - 0331-4489310
nastalique786@gmail.com

CamScanner